تفسیر

سورۃ فاتحہ

تفسیر
سورۂ فاتحہ

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

DARUSSALAM
دارالسلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ھیوسٹن • نیو یارک

دارُالسّلام
کتاب وسنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
دارالسلام DARUSSALAM

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4033962-4043432 1 00966
فیکس: 4021659 E-mail: darussalam@awalnet.net.sa
Website: www.dar-us-salam.com

❶ طریق مکہ۔ العلیا۔ الریاض فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945
❷ شارع اربعین۔ الملز۔ الریاض فون: 4735220 فیکس: 4735221
❸ جدّہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270
❹ الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551

شارجہ فون: 5632623 6 00971
فیکس: 5632624

لندن فون: 85394885 20 0044
فیکس: 85394889 020

امریکہ ❶ ہوسٹن فون: 7220419 713 001
فیکس: 7220431
❷ نیویارک فون: 6255925 718 001
فیکس: 6251511

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

❶ 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092 فیکس: 7354072
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com
❷ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703
❸ مُون مارکیٹ اقبال ٹاؤن۔ لاہور فون: 7846714

کراچی شوروم Z-110,111 (D.C.H.S) مین طارق روڈ (بالمقابل فری پورٹ شاپنگ مال) کراچی
فون: 0092-21-4393936 فیکس: 4393937
Email: darussalamkhi@darussalampk.com

اسلام آباد شوروم F-8 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2500237

مضامین

عرضِ ناشر

قرآن مجید فرقانِ حمید جس کا نزول خاتم النبیین ﷺ پر ہوا، ہدایت الٰہی کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے انسانیت تا ابد سیراب ہوتی رہے گی۔ اس کی تعلیمات خالص توحید سے مزیّن، ہر لحاظ سے محکم، تحریف سے پاک اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ قرآن مجید کے متن کا تحریف وتبدل سے یکسر پاک ہونا، اس کی سچائی اور اس کے من جانب اللہ ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ ہمارے اسلاف نے قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے دُنیا و آخرت کی نعمتیں اور بلندیاں حاصل کیں اور وہ اس بے بدل کتاب کی بدولت دُنیا کے پیشوا اور رہنما بن گئے۔

فرزندانِ اسلام قرآن ہاتھوں میں لیے دُنیا بھر میں پھیل گئے اور ان سے فیض پا کر مختلف معاشرے کتابِ الٰہی کی تعلیمات اور ابدی برکات سے بہرہ ور ہوتے چلے گئے اور آج بھی ادبار ونکبت کے اس دور میں اسلام کے نام لیوا قرآن کریم ہی کے ذریعے سے دُنیا و عقبیٰ کی کامرانیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کو کما حقہ سمجھنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے تفسیر سے رجوع کرنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، چنانچہ عربیٔ مبین میں نازل شدہ قرآن مجید کی عربی تفاسیر کے علاوہ مختلف زمانوں اور زبانوں میں بہت سی تفسیریں لکھی گئی ہیں جن میں اُردو نمایاں طور پر شامل ہے۔ قرآنی تفسیر کی بنیاد خود قرآن مجید کی آیات، نبیٔ اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال و اعمال اور لغت کے نکات ہیں، چنانچہ مختلف زبانوں میں اہل علم وفضل نے انھی بنیادوں پر تفسیریں لکھی ہیں۔ گزشتہ چند صدیوں میں اُردو زبان میں کئی تفاسیر لکھی گئی ہیں جو اپنی جگہ بہت وقیع ہیں لیکن ایک جامع اور احادیث صحیحہ پر مبنی تفسیر کی بہر حال ضرورت تھی جس کی تحریر وتکمیل کے اہتمام اور اشاعت کی سعادت دارالسلام کو حاصل ہوئی ہے۔ وللّٰہ الحمد!

حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ عہدِ حاضر کے نامور مفسّر ہیں جن کی مرقوم تفسیر احسن البیان دارالسلام کے زیرِ اہتمام چھپ کر اردو خواں دُنیا میں خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ احسن البیان بہت جامع مگر مختصر تفسیر ہے۔ حافظ صاحب نے چند سال پہلے اسے قدرے تفصیل سے لکھنے کا بیڑا اٹھایا مگر یہ عظیم الشان اور وقت طلب کام بوجوہ سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ کی تفسیر کے آغاز ہی میں رُک گیا، اس وجہ سے فی الحال تفسیر سورۃ الفاتحہ کا یہ جُز افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے جبکہ دارالسلام سٹوڈیو اسے پہلے ہی کیسٹوں کی صورت میں پیش کر چکا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کی زیرِ نظر تفسیر آسان اور عام فہم ہے۔ حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی ہیں، لہٰذا ان کی اُردو تحریر ہر طرح کے ابہام و اغلاق سے پاک ہے۔ انھوں نے سورۃ الفاتحہ کے تفسیری نکات صحیح احادیث کی روشنی میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کا استدلال بہت دلنشیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے غفور اور رحیم ہونے کا غلط مطلب لے کر نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے مغالطے کی وضاحت کرتے ہوئے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ حُسن ظن رکھنے کا تعلق ہے، یقیناً ایک مومن کو اس کی تاکید کی گئی ہے لیکن ایک مومن کہلانے والا پہلے ایمان کے مقتضیات پر عمل تو کرے، مومن بن کر تو دکھائے۔ ایک شخص کے پاس اچھی زمین ہو لیکن نہ وہ اس میں ہل چلائے، نہ بیج بوئے اور نہ اسے پانی دے اور امید رکھے کہ زمین سے بہت اچھی پیداوار ہوگی۔ ایک شخص اولاد کی خواہش رکھے مگر وہ نکاح ہی نہ کرے۔ ایک شخص ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان وغیرہ بننا چاہے لیکن وہ کتابیں پڑھے نہ کالج اور یونیورسٹی میں جا کر اساتذہ سے علم حاصل کرے۔ کیا ایسے لوگوں کو یہ اُمیدیں رکھنے کا حق حاصل ہے؟......''

محترم حافظ صاحب نے خطوط اور تحریری معاہدوں میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ 786 لکھنے کے رواج کا بھی مدلّل رد کیا ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر کے ضمن نماز میں بسم اللہ سرّی یا جہری پڑھنے، فاتحہ خلف الامام، سورۂ فاتحہ کی تاثیر و برکت، تعلیم قرآن یا دَم پر معاوضہ لینے کا مسئلہ، ''سورت'' کے معنی اور دیگر بہت سے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں جس سے اس تفسیر کی علمی و عملی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔

تفسیر سورۃ الفاتحہ کی تخریج و تکمیل اور پروف ریڈنگ کی ذمہ داری دارالسلام کے رفقائے کار طارق جاوید عارفی، منیر احمد رسولپوری، حافظ عبداللہ ناصر اور منیر احمد رسولپوری نے انجام دی ہے۔ جناب زاہد سلیم چودھری، ہارون الرشید ابومصعب اور محمد رمضان شاد نے اغلاط سے پاک کمپوزنگ اور کتاب کی زینت میں اضافے کے لیے قابل قدر محنت کی۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس تفسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے دارالسلام اور اس کے جملہ کارکنان کے حق میں خیر و برکت کے حصول اور دنیا و آخرت میں فوز و فلاح کی دعا کریں!

خادم کتاب و سنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر دارالسلام۔ الریاض، لاہور

رمضان 1427ھ/اکتوبر 2006ء

عرضِ مفسر

تفسیر سورۃ الفاتحہ، یہ اس تفسیر سورۃ الفاتحہ سے الگ ایک نئی تفسیر ہے جو تفسیر ''احسن البیان'' میں شامل ہے۔

اس کی وجہ تالیف یہ ہے کہ بہت سے احباب اور بزرگوں کی خواہش تھی کہ ''احسن البیان'' کے علاوہ قدرے تفصیل سے ایک اور تفسیر لکھی جائے، خود راقم کی خواہش اور کوشش بھی تھی کہ یہ کام ہونا چاہیے۔

اسی خواہش کی تکمیل کے پیش نظر آج سے چند سال قبل ایک نئی تفسیر کے لکھنے کا آغاز راقم نے کیا تھا، تفسیر سورۃ الفاتحہ لکھ لی تھی لیکن سورۃ البقرہ کی تفسیر کے آغاز ہی میں یہ کام دوسرے علمی کاموں کی وجہ سے بند ہو گیا اور جب سے اب تک بند ہی ہے۔

﴿لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾

اس لیے یہ تجویز ذہن میں آئی کہ تفسیر سورۃ الفاتحہ کا یہ جُز تو کم از کم شائع کر دیا جائے، جبکہ کیسٹوں کی صورت میں یہ جُز دارالسلام سٹوڈیو کی طرف سے پہلے ہی منظر عام پر آچکا ہے۔

احباب اور بزرگانِ کرام سے درخواست ہے کہ وہ راقم کی صحت و عافیت اور زیادہ سے زیادہ توفیقِ مرضیات کی خصوصی دعا فرماتے رہیں۔ اللہ کے فضل اور آپ کی دعاؤں سے شاید ایک متوسط تفسیر کے لکھنے کی سعادت بھی اللہ تعالیٰ عطا فرما دے۔ ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾

رمضان 1427ھ، اکتوبر 2006ء

حافظ صلاح الدین یوسف

تفسیر سورۃ الفاتحہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ سے ہوتا ہے۔ بسم اللہ کو اِصطلاح میں بَسْمَلَه کہتے ہیں، یعنی بسم اللہ پڑھنا۔

بسم اللہ کا معنی

﴿بِسْمِ اللّٰہِ﴾ یہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک حرفِ باء، دوسرے اسم اور تیسرے لفظ اللہ سے۔ حرفِ باء متعدد معانی کے لیے آتا ہے، مثلاً: مصاحبت کے لیے، مصاحبت کا مطلب ہے متصل اور ساتھ ہونا۔ استعانت کے لیے، استعانت کے معنی ہیں مدد طلب کرنا۔ برکت کے لیے۔ اس اعتبار سے بسم اللہ کے بالترتیب یہ معنی ہوں گے:

- اللہ کے نام کے ساتھ۔
- اللہ کے نام کی مدد سے۔
- اللہ کے نام کی برکت سے۔

عربی میں باء حرف جار ہے، مابعد والا لفظ (جیسے یہاں اسم ہے) مجرور کہلاتا ہے۔ جار مجرو کسی نہ کسی سے متعلق ہوتا ہے، وہ فعل بھی ہوسکتا ہے اور اسم بھی، جیسے بِسْمِ اللّٰہِ ابْتِدَائِیْ بِسْمِ اللّٰہِ أَ بْتَدِءُ۔ اسی طرح محذوف فعل یا اسم پہلے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے۔ محذوف فعل یا اسم کے اعتبار سے معنی ہوں گے، اللہ کے نام سے، یا اللہ کے نام کی مدد یا برکت سے میری ابتدا ہے، یا ابتدا کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے...... اللہ کے نام سے میری تلاوت قراءت ہے، یا میں تلاوت یا قراءت کرتا ہوں اللہ کے نام سے۔ اسی طرح اللہ کے نام سے

ہے میرا کھانا، یا کھاتا ہوں میں اللہ کے نام سے...... اللہ کے نام سے ہے میرا لکھنا، یا لکھتا ہوں میں اللہ کے نام سے وغیرہ۔

اسم: بعض کے نزدیک اصل میں سُمُوٌّ ہے جس کے معنی ہیں "بلندی" اور بعض کے نزدیک سِمَةٌ ہے جس کے معنی ہیں "علامت"، یعنی ایسا لفظ جو اپنے مُسمّٰی کے لیے ایک علامت ہے جس سے وہ پہچانا جاتا اور دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔

اللہ: اسم عَلَم ہے جو رب تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ اصل میں إِلٰہٌ ہے۔ إِلٰہٌ کے معنی ہیں "معبود"۔ اس میں ہمزہ حذف کر کے اس کی جگہ الف اور لامِ تعریف (أَلْ) کا اضافہ کر کے لفظ اللہ بنا دیا گیا، اور اس طرح أَلْ لفظ إِلٰہٌ کا لازمی جز بن گیا ہے۔

یہ أَلِهَ يَأْلَهُ إِلٰهَةً وَأُلُوهَةً سے مشتق ہے جس کے معنی عبادت کرنے کے ہیں۔ إِلٰہٌ، مَأْلُوهٌ (مفعول) کے معنی میں ہے، یعنی معبود۔ إِلٰہٌ کا لفظ بطور اسمِ جنس، ہر قسم کے معبود پر بولا جاتا ہے لیکن لفظ "اللہ" معبود حقیقی کے علاوہ کسی کے لیے استعمال نہیں ہوتا حتی کہ مشرکین مکہ بھی یہ لفظ صرف اللہ ہی کے لیے بولتے تھے، حالانکہ انھوں نے متعدد بت لات، عُزّٰی، منات اور هُبَل وغیرہ بنا رکھے تھے جن کو وہ حاجت روا، مشکل کشا اور کائنات میں تصرف کرنے والا سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان کی خوشنودی کے لیے ان کے نام کی نذر و نیاز بھی دیتے تھے، ان سے مدد بھی طلب کرتے تھے اور ان کی پرستش بھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب سے برتر اور اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے اور آسمان و زمین کا خالق و مالک، مدبرِ کائنات اور مخلوقات کا رازق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تسلیم کرتے تھے جیسا کہ قرآن کریم نے تصریح کی ہے:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾

"اور بلاشبہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو (کس نے) مسخر کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔"[1]

---

[1] العنکبوت61:29.

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾

''اور البتہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر زمین کی موت (ویرانی) کے بعد اس پانی سے اسے زندہ (تروتازہ) کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے۔'' [1]

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: تمھیں آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے یا کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے اور کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ۔'' [2]

یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ ''اللہ'' مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے نہیں بولتے تھے۔ اسی لیے بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ اسم اعظم بھی یہی لفظ اللہ ہے جس کی فضیلت احادیث میں یہ وارد ہے کہ اس کے ذریعے سے کی جانے والی دعا رد نہیں ہوتی۔ [3]

الرحمٰن الرحیم کا معنی و مفہوم

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں۔ اور یہ دونوں رحمت سے

---

[1] العنکبوت 29:63 [2] یونس 10:31

[3] سنن أبي داود، الوتر، باب الدعاء، حديث: 1493-1494-1495-1496

مشتق ہیں اور فَعْلان اور فَعِیل کے وزن پر مبالغے کے صیغے ہیں جن میں کثرت اور دوام واستمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بہت رحم کرنے والا ہے اور اس کی یہ صفت دیگر صفات کی طرح دائمی ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں، رحمٰن میں رحیم کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، اسی لیے رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَ الْآخِرَۃ (دنیا اور آخرت دونوں میں رحم کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں اس کی رحمت عام ہے جس سے بلا تخصیص کافر اور مومن سب فیض یاب ہو رہے ہیں۔ سب کو سامانِ رزق اور وسائلِ زندگی مہیا ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی نافرمان کو محض اس کی نافرمانی کی وجہ سے دنیا کے اسباب اور وسائل سے محروم نہیں کرتا اور کسی فرماں بردار کو محض اس کی اطاعت اور فرماں برداری کی وجہ سے عیشِ فراواں سے نہیں نوازتا بلکہ رزق کی یہ کمی بیشی وہ اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت کرتا ہے جس کا علم صرف اسی کو ہوتا ہے۔ اگر اس کی حکمت کافروں کو بے پایاں دنیا دینے میں ہوتی ہے تو وہ انھیں ایک خاص مدت تک خوب نوازتا ہے اور اگر اس کی حکمت مومنوں کو عسرت و تنگ دستی میں مبتلا کرنا ہوتی ہے تو وہ انھیں نانِ جویں (روکھی سوکھی) اور قُوتِ لَا یَمُوت (جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے) سے زیادہ نہیں دیتا۔

اور اللہ تعالیٰ آخرت میں صرف رحیم ہوگا، یعنی اس کی رحمت صرف مومنوں کے لیے خاص ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ﴾

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، چنانچہ جلد ہی میں اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔''[1]

---

[1] الأعراف 156:7

تاہم کبیرہ گناہوں کے مرتکب اہل ایمان کا بطور سزا عارضی طور پر جہنم میں جانا، اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ ان کے لیے خلود فی النار نہیں ہے۔ اوران کا عارضی طور پر بطور سزا جہنم میں جانا اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا عین تقاضا ہے تاکہ کامل الایمان اور ناقص الایمان میں فرق ہو سکے۔ روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی ''صفتِ عدل'' کے کامل ظہور کا وقت ہوگا، اس روز بے لاگ انصاف ہوگا اور جس نے جس قسم کا اچھا یا برا عمل کیا ہوگا، اس کے مطابق اسے اچھی یا بری جزا ملے گی حتی کہ بہت سے مومنوں کو بھی، جو گناہ گار ہوں گے، اللہ تعالیٰ سزا کے طور پر جہنم میں داخل فرمائے گا اور پھر سزا بھگتنے کے بعد یا رسول اللہ ﷺ کی شفاعت پر یا اپنے فضل وکرم سے انھیں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کرے گا۔

علاوہ ازیں رحمٰن اور رحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اوراللہ تعالیٰ کی رحیمیت کے زیادہ سے زیادہ اظہار کے لیے ان دونوں کو ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور تعبیر و بیان کا یہ اسلوب ہر زبان میں ملتا ہے۔

- یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی کی مظہر ہے۔
- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے وہ اپنوں اور بیگانوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا بلکہ سب کو کم وبیش کے فرق کے ساتھ دنیا دیتا ہے۔
- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے وہ نافرمانوں کی فوراً گرفت نہیں کرتا، حالانکہ وہ اس بات پر قادر ہے لیکن وہ ایک خاص وقت تک ہر فرد اور قوم کو مہلت دیتا ہے۔
- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کتابوں اور انبیاء ورسل کا سلسلہ قائم فرمایا اور قیامت تک اہل حق کا ایک گروہ برقرار رکھا تاکہ انسانوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچایا جائے۔
- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے اس نے انسانوں کو عقل وشعور سے نوازا اور ادراک واحساس

کی قوت عطا کی تاکہ وہ ان کے ذریعے سے حق کا پتہ چلائیں، اس کو سمجھیں، اسے اختیار کریں اور ضلالت و گمراہی سے بچیں۔

- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے اس نے انواع و اقسام کی نعمتیں پیدا کر کے مخلوق کے کام و دہن کی لذتوں کا سامان خوب فراہم کیا۔
- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے اتمامِ حجت کے بغیر وہ کسی قوم یا فرد کو ہلاکت اور تباہی سے دوچار نہیں کرتا۔
- اپنی رحیمیت ہی کی وجہ سے وہ بڑے سے بڑے گناہ گار، نہایت سرکش اور نافرمان کی بھی توبہ قبول فرمالیتا ہے، بشرطیکہ خلوص دل سے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی اس وسعت کو قرآن کریم میں بھی بیان فرمایا ہے، جیسے فرمایا:

﴿فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ﴾

''اے پیغمبر! اگر یہ آپ کی تکذیب کر رہے ہیں تو ان سے کہہ دیں، تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے (اس لیے تکذیب پر فوراً گرفت نہیں کرتا)۔''[1]

اور فرمایا:

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔''[2]

اور احادیث میں نبی ﷺ نے بھی اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے، جیسے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَمَّا قَضَى اللهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهِ فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي»

---

[1] الأنعام 147:6 [2] الأعراف 156:7

''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو لوحِ محفوظ میں لکھا، جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے، بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''[1]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے، ان قیدیوں میں ایک ایسی عورت بھی تھی جس کے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا تاکہ وہ دودھ پلائے (وہ اپنے بچے کو تلاش کرتی پھرتی تھی) جب بھی قیدیوں میں وہ کوئی چھوٹا بچہ دیکھتی، اسے پکڑ کر سینے سے چمٹا لیتی اور دودھ پلانے لگ جاتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (اسے دیکھ کر) فرمایا:

«أَتَرَوْنَ هٰذِهِ طَارِحَةً وَّ لَدَهَا فِي النَّارِ؟»

''تمھارا کیا خیال ہے، کیا یہ (عورت) اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی؟''

ہم نے کہا: نہیں، وہ طاقت رکھتے ہوئے کبھی بھی خوشی سے اسے آگ میں نہیں پھینکے گی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَلّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا»

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی یہ (ماں) اپنے بچے پر ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ فِي مِائَةِ جُزْءٍ فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَّ تِسْعِينَ جُزْءًا وَّ أَنْزَلَ فِي الْأَرْضِ جُزْءًا وَّاحِدًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ تَتَرَاحَمُ الْخَلْقُ، حَتّٰى تَرْفَعَ الْفَرَسُ حَافِرَهَا عَنْ وَّلَدِهَا خَشْيَةَ أَنْ تُصِيبَهُ»

''اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کیے، اس میں سے ننانوے حصے اپنے پاس روک

---

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، باب ما جاء في قول الله تعالىٰ:﴿وهو الذي يبدؤ الخلق......﴾، حديث:3194

[2] صحيح البخاري، الأدب، باب رحمة الولد و تقبيله و معانقته، حديث:5999
و صحيح مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالىٰ...... ، حديث:2754

لیے اور ایک حصہ زمین میں اتارا، اسی ایک حصے کی وجہ سے مخلوق باہم ایک دوسرے کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا معاملہ کرتی ہے حتی کہ گھوڑا اپنا سُم اپنے بچے سے اٹھا لیتا ہے کہ کہیں وہ اس کی زد میں نہ آجائے۔'' [1]

ایک دوسری روایت میں ہے:

«إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ، أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَّاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ، فَبِهَا يَتَعَاطَفُونَ، وَبِهَا يَتَرَاحَمُونَ، وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَلَدِهَا وَأَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَّتِسْعِينَ رَحْمَةً يَّرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے اس نے ایک رحمت جنوں، انسانوں، مویشیوں اور کیڑے مکوڑوں کے درمیان نازل کی ہے۔ اسی ایک رحمت کی وجہ سے یہ سب باہم ایک دوسرے کے ساتھ نرمی و شفقت اور رحم و کرم کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے وحشی جانور بھی اپنے بچے کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے اور ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس روک رکھی ہیں جن کے ذریعے سے وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم کرے گا۔'' [2]

ایک اور روایت میں ہے:

«فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ، أَكْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَةِ»

''جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس دنیاوی رحمت کو بھی اپنی رحمت کے ساتھ ملا کر اسے پورا کرلے گا۔'' [3]

---

[1] صحيح البخاري، الأدب، باب جعل الله الرحمة في مائة جزء، حديث: 6000 و صحيح مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى......، حديث:2752

[2] صحيح مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى......، حديث:2752

[3] صحيح مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى......، حديث:2753

یعنی پورے سو حصوں کے ساتھ اپنی مخلوق پر رحم فرمائے گا۔

اسی لیے ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الْعُقُوبَةِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ، وَّلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ»

''اگر مومن کو اس سزا اور عقوبت کا (پورا) علم ہو جائے جو اللہ کے ہاں (کافروں کے لیے) ہے تو کوئی اس کی جنت کی امید نہ رکھے، اور اگر کافر اس رحمت کو جان لے جو اللہ کے پاس ہے تو اس کی جنت سے کوئی ناامید نہ ہو۔'' [1]

اللہ تعالیٰ کی اسی وسعتِ رحمت کی وجہ سے تاکید کی گئی ہے کہ

﴿لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾

''تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بے شک اللہ سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' [2]

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بطور خاص ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے بہت زیادہ گناہ کیے ہوں حتی کہ وہ یہ گمان کرنے لگے ہوں کہ اگر ہم نے توبہ بھی کی تو شاید اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی غلط فہمی کو دور فرمایا اور وضاحت فرمائی کہ تم اپنے گناہوں کی کثرت کو مت دیکھو، اللہ کی رحمت کی وسعت کو دیکھو، اگر تم خلوص دل سے توبہ کر کے اس کے بندے بن جاؤ گے تو وہ اب بھی تمھارے سارے گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دے گا۔

مذکورہ آیات اور احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے اور اس کی وسعت رحمت کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ دنیا میں اس سے سب فیض یاب ہو رہے ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے نیک بندوں کو اپنے خصوصی انعام اور اکرام

---

[1] صحيح مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى ......، حديث: 2755 [2] الزمر 39: 53

سے نوازے گا اور انھیں اپنے دامانِ رحمت میں ڈھانپ لے گا۔ لیکن اس کی یہ رحمت اپنے مومن بندوں پر اس لیے نہیں ہوگی کہ وہ اس روز صرف مومنوں ہی کے لیے رحیم ہوگا بلکہ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ انھوں نے دنیا میں خالص توبہ کر کے یا اعمال صالحہ کے ذریعے سے اس کو راضی کرلیا جس کا صلہ رحمت اور مغفرت ہوگی۔ اور کافر اس روز اس کی رحمت اور مغفرت سے محروم ہوں گے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ وہ کافروں کے لیے رحیم نہیں ہوگا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہوگی کہ کافروں نے دنیا میں رہ کر ایسے کام کیے ہوں گے جس سے وہ عقوبتِ الٰہی کے سزاوار ٹھہریں گے، اس لیے ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت ''صفتِ عدل'' کا ظہور ہوگا، چنانچہ ان کے عملوں کے مطابق ان کو جہنم کے عذاب کی صورت میں جزا ملے گی۔ اور جہنم کے عذاب کی یہی سزا عارضی طور پر بعض اہل ایمان کو بھی ملے گی کیونکہ ایمان کے باوجود انھوں نے کچھ ایسے کبیرہ گناہ کیے ہوں گے جن سے انھوں نے توبہ نہیں کی ہوگی، اس لیے اگر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ انھیں بھی ان گناہوں کی سزا دی جائے تو وہ بھی یقیناً جہنم میں جائیں گے۔ لیکن چونکہ ان کا گناہ خلود فی النار کے استحقاق کا باعث نہیں ہوگا، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں، اس لیے سزا بھگتنے کے بعد باہر آجائیں گے اور کافروں کا جرم خلود فی النار (دائمی جہنم) کا مستحق ہوگا، چنانچہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا ہے جس کا ظہور قیامت کے روز ہوگا۔

غفور و رحیم ہونے کا مطلب اور ایک مغالطے کی وضاحت

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں دلیر اور بے خوف نہیں ہونا چاہیے، جیسے بعض لوگ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور اور رحیم ہے اور پھر نہایت بے خوفی سے معصیتوں (نافرمانیوں) کا ارتکاب کرتے، حدودِ الٰہی کو توڑتے اور اس کے

ضابطوں کو پامال کرتے ہیں۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھنا چاہیے کیونکہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي»

''میرا بندہ میرے ساتھ جیسا گمان کرے گا، میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کروں گا۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ واقعی غفور اور رحیم ہے لیکن اس کا مطلب یہ کب ہے کہ انسان اس کے عذاب اور مؤاخذے سے بالکل بے فکر ہو جائے اور اس کا بندہ بننے کے بجائے شیطان کا اور خواہشِ نفس کا بندہ بن جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا امیدوار بھی رہے؟ یہ نفس اور شیطان کا دھوکا ہے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً غفور اور رحیم ہے لیکن کب؟ اور کن کے لیے؟ جب اس کو راضی کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے معصیتوں سے اجتناب اور طاعات و عبادات کا اہتمام کیا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے، انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہ لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔''[2]

یعنی یہ سارے کام کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنی چاہیے، نہ کہ ان کے بغیر ہی۔ اعمالِ صالحہ کے بغیر رحمت کی امیدیں تو محض جھوٹی آرزوئیں ہیں جن کی کوئی حیثیت اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿و يحذركم الله نفسه﴾، حديث: 7405 و صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب الحث على ذكر الله تعالى، حديث: 2675 [2] البقرة 2: 218

﴿ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

"پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے ستائے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا تو اس کے بعد تیرا رب یقیناً بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔"[1]

یعنی ہجرت، جہاد اور صبر کرنے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کی امید کی جاسکتی ہے، نہ کہ ان اعمال کے بغیر ہی۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھنے کا تعلق ہے تو یقیناً ایک مومن کو اس کی تاکید کی گئی ہے لیکن ایک مومن کہلانے والا پہلے ایمان کے مقتضیات پر عمل تو کرے، مومن بن کر تو دکھائے۔ ایک شخص کے پاس اچھی زمین ہو لیکن نہ وہ اس میں ہل چلائے، نہ بیج بوئے اور نہ اسے پانی دے اور امید رکھے کہ زمین سے بہت اچھی پیداوار ہوگی۔ ایک شخص اولاد کی خواہش رکھے لیکن وہ نکاح ہی نہ کرے۔ ایک شخص ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان وغیرہ بننا چاہے لیکن وہ کتابیں پڑھے، نہ کالج اور یونیورسٹی میں جا کر اساتذہ سے علم حاصل کرے۔ کیا ایسے لوگوں کو یہ امیدیں رکھنے کا حق حاصل ہے؟ کیا لوگ ایسے امیدواروں کو بے وقوف کہیں گے یا عقل مند؟ ایک غلام آقا کی خدمت کرنے کے بجائے بھاگ جائے اور اس کی نافرمانی کرے۔ کیا ایسا غلام اپنے آقا سے اچھی امید رکھ سکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ انسان جیسی امید رکھے، اس کے لیے اس کے ضروری اسباب بھی اختیار کرے، اس کے بغیر امید، حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے اہل ایمان، جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھنے کا حکم ہے، ایسے اعمال بھی بجالاتے ہیں جن سے ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے اور اس کی نافرمانیوں سے اجتناب بھی کرتے ہیں کہ کہیں وہ اس کی گرفت

[1] النحل 110:16

میں نہ آجائیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے:

«اَلْإِيمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ»

''ایمان خوف اور امید کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔''

یعنی ایمان دار اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتا ہے، اسے خوف ہوتا ہے کہ نافرمانیوں سے اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہوجائے اور ایمان وتقویٰ کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اعمالِ صالحہ اختیار کرتا ہے، پھر امید رکھتا ہے کہ ان سے اللہ راضی ہوجائے گا اور اپنی مغفرت ور رحمت سے نواز دے گا۔ گویا مومن اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہوتا ہے، نہ اس کی رحمت سے ناامید۔

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں متعدد جگہ اپنے عذاب اور اپنی رحمت کا ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے تاکہ انسان کے سامنے دونوں پہلو ہر وقت موجود رہیں اور کسی ایک کا غلبہ، دوسرے کے ذہول ونسیان کا سبب نہ بنے کیونکہ دونوں کا بیک وقت ذہنوں میں رہنا ضروری ہے، ورنہ انسان افراط یا تفریط کا شکار ہوجاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں جہاں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ فرما کر اپنی صفت رحیمیت کو بیان فرمایا تو اس کے ساتھ ہی ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (وہ جزا کے دن کا مالک ہے) فرما کر اپنی بے پناہ قوت اور طاقت کا اظہار بھی فرمادیا۔ سورۃ الحجر میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ○ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾

''(اے نبی!) میرے بندوں کو خبر سنا دیجیے کہ یقیناً میں بخشنے والا، نہایت مہربان ہوں۔ اور بے شک میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔''[1]

بنا بریں راہِ صواب اور نقطۂ اعتدال یہی ہے کہ ایک مومن کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید بھی

---

[1] الحجر 15: 49-50

رکھنی چاہیے اوراس کے عذاب سے لرزاں وترساں بھی رہنا چاہیے۔

رحمت کی امید، اسے ایمان وتقویٰ کی زندگی گزارنے پر آمادہ کرے اور عذاب کا خوف، اسے معصیتوں سے دور رکھے۔ ایسی ہی پاکباز زندگی ایک مومن کا طرۂ امتیاز ہے جس پر اس کے لیے رحمت ورضوان اور انعام واکرام کی خوش خبری ہے۔

رَزَقَنَا اللّٰهُ تَعَالٰی إِیَّانَا هٰذِهِ الْحَیَاةَ الطَّیِّبَةَ۔

بسم اللہ پڑھنے کی حکمت اوراس کے فوائد

ویسے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہر بات میں حکمت اور فائدہ ہوتا ہے، چاہے ہماری عقل وفہم کی رسائی وہاں تک ہو یا نہ ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکموں میں حکمتیں اورفوائد تلاش کرنے ضروری نہیں ہیں کیونکہ ان پر ہر صورت میں عمل کرنا واجب ہے۔ تاہم جن احکام کی حکمتیں اورفوائد واضح ہوں، ان کو سمجھ لینا اچھا ہی ہے کیونکہ اس سے یقین اوراعتماد میں اضافہ ہوتا ہے اورعمل کی مزید ترغیب ملتی ہے۔

بسم اللہ پڑھنے میں یہ حکمت اور فائدہ ہے کہ ہر کام کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی پُرعظمت ہستی کا تصور سامنے آجاتا ہے جس سے انسان کی نیت صحیح اور رُخ سیدھا ہوجاتا ہے اورانسان غلط کام کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اوراس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمٰن اور رحیم کی صفات کے پیش نظر انسان مایوس نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے صرف مہربان ہی نہیں بلکہ نہایت مہربان ہونے کا تصور، قدم قدم پر انسان کو حوصلہ بخشتا اوراس کے عزم و ہمت کو فزوں تر کرتا ہے۔ یوں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ گویا تاریکیوں میں روشنی کی کرن، مایوسیوں میں امید کا چراغ اور مشکلات کے بھنور میں ایک مضبوط اورقوی سہارا ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی مُصَاحَبَت، اس کی اِعَانَت اوراس کی طرف سے خصوصی برکت حاصل ہوجاتی ہے۔

786، عدد کی حقیقت

ہمارے ملک میں ایک رواج یہ ہے کہ خطوط اور تحریری معاہدوں وغیرہ میں بسم اللہ کی جگہ 786 کا عدد لکھ دیا جاتا ہے جو ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کے عدد بنتے ہیں۔ یہ رواج بالکل غلط اور عقل ونقل کے خلاف ہے۔ اِس کے خلافِ عقل ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آج تک کوئی شخص بولنے کے وقت بسم اللہ کی جگہ 786 کے اعداد نہیں بولتا، مثلاً: کھانے کے وقت یہ نہیں کہا جاتا: 786۔ وضو شروع کرتے وقت نہیں کہا جاتا: 786۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس بسم اللہ کے دوسرے مواقعِ استعمال ہیں۔ کہیں بھی ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کی جگہ 786 کے اعداد استعمال نہیں کیے جاتے بلکہ کھانے کے شروع میں، وضو کے آغاز میں اور اسی طرح ہر اہم کام کی ابتدا میں بسم اللہ ہی پڑھی اور بولی جاتی ہے، نہ کہ 786۔ جب حقیقت اور واقعہ یہ ہے تو پھر خط یا تحریر میں بسم اللہ کی جگہ 786 لکھنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟ کیا تلاوتِ قرآن کا آغاز 786 سے کیا جاسکتا ہے؟

786 کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ بسم اللہ لکھنے سے اللہ تعالیٰ کے نام کی بے حرمتی ہوتی ہے، اس لیے 786 لکھتے ہیں لیکن یہ بھی کوئی معقول دلیل نہیں، اس طرح تو خطوں میں، اخبارات میں اور دیگر تحریروں میں نام بھی نہیں لکھنے چاہئیں کیونکہ ہر مسلمان کے نام میں بالعموم اللہ کا نام یا محمد ﷺ کا نام بطور جُز ضرور شامل ہوتا ہے، جیسے عبداللہ، عبدالرحمٰن، عبدالغفار، محمد یوسف، محمد یونس، محمد احمد وغیرہ ہیں۔ کیا کسی عبداللہ نامی شخص نے، جو بسم اللہ کی جگہ 786 لکھتا ہو، کبھی خط کے آخر میں اپنا نام لکھنے کی بجائے اپنے نام کے صرف عدد لکھے؟ یقیناً نہیں لکھے ہوں گے۔ اس لیے یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ اس طرح اللہ کا نام لکھنے سے بے حرمتی نہیں ہوتی۔ بے حرمتی صرف اسی وقت ہوگی جب انسان بے حرمتی کی نیت سے اِرادتاً ایسا کرے گا ورنہ کوئی مسلمان بے حرمتی کا مرتکب قرار نہیں پائے گا۔

کیا بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کی آیت ہے؟

اس بات میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ اس میں تو سب کا اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ کی آیات سات ہیں لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ ہی کی ایک آیت ہے تو وہ اس کے علاوہ چھ آیات تسلیم کرتے ہیں۔ اور جن کے نزدیک بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے، ان کے نزدیک ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ پر چھ آیات ہوجاتی ہیں اور ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ ساتویں آیت ہے۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کے شروع میں تحریر ہوتی ہے لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا بسم اللہ سورۂ فاتحہ یا ہر سورت کی آیت ہے یا ہر سورت کے آغاز میں اس کے لکھنے کا کوئی اور مقصد ہے؟

ایک رائے یہ ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سورۂ نمل کی آیت کا حصہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ باقی ہر سورت کے شروع میں اسے جو لکھا جاتا ہے تو اس لیے نہیں کہ یہ اس سورت کی مستقل آیت یا اسی کا حصہ ہے بلکہ اِنَّمَا كُتِبَتْ لِلْفَصْلِ وَالتَّبَرُّكِ، یعنی اس کا ایک مقصد تو برکت حاصل کرنا ہے اور دوسرا مقصد، اس کے ذریعے سے ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ اور ممتاز کرنا ہے۔ اس رائے کی تائید میں سنن ابی داود اور صحیح الجامع کی وہ حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ اس وقت تک ایک سورت کے دوسری سورت سے جدا ہونے کو نہیں پہچانتے تھے، جب تک ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ نہ اترتی۔ [1]

اس حدیث سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ بسم اللہ کسی سورت کی مستقل آیت نہیں ہے، وہاں اس بات کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ ہر سورت کے آغاز میں اس کا لکھنا اور پڑھنا ضروری ہے، سوائے سورۂ توبہ کے کیونکہ سورۂ توبہ کے آغاز میں اسے تحریر نہ کرنے پر سب کا

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، باب من جهربها، حديث:788 و صحيح الجامع الصغير، حديث:4864

اتفاق ہے۔ تاہم اگر کوئی تلاوت کا آغاز ہی سورۂ توبہ سے کرے تو اعوذ باللہ کے ساتھ بسم اللہ پڑھ کر اس کا آغاز کر سکتا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ سمیت ہر سورت کی مستقل آیت ہے، سوائے سورۂ توبہ کے۔ اس کی تائید میں صحیح مسلم کی یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا:

«أُنْزِلَتْ عَلَيَّ آنِفًا سُورَةٌ»

''مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے۔''

پھر آپ نے ﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھ کر سورة الکوثر کی تلاوت فرمائی۔ [1]

لیکن یہ حدیث اس امر میں واضح نہیں کہ نبی ﷺ نے تلاوت سے پہلے بسم اللہ اس لیے پڑھی کہ آپ اسے اس سورت کی آیت سمجھتے تھے یا سورة الکوثر کے ساتھ ہی بسم اللہ کا بھی نزول ہوا تھا بلکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ آپ نے اسے تبرک اور فصل ہی کے طور پر پڑھا ہو۔ اس اعتبار سے اس حدیث سے بھی پہلی رائے کی تائید ہوتی ہے کہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ کی حیثیت تبرک اور فصل کے لیے ہے نہ کہ اس کا جُز ہونے کی حیثیت سے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک حدیثِ قُدسی میں ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَ بَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ وَ لِعَبْدِي مَا سَأَلَ»

''میں نے نماز (سورۂ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔''

چنانچہ جب بندہ کہتا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

---

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب حجة من قال: البسملة آية من أول كل سورة سوى براءة، حديث: 400

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«حَمِدَنِي عَبْدِي»

''میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔''

اور جب (بندہ) کہتا ہے:

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

''نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«أَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِي»

''میرے بندے نے میری ثنا بیان کی۔''

اور جب (بندہ) کہتا ہے:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾

''بدلے کے دن کا مالک ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«مَجَّدَنِي عَبْدِي، وَ قَالَ مَرَّةً، فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي»

''میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، میرے بندے نے اپنے معاملے کو میرے سپرد کر دیا۔''

اور جب (بندہ) کہتا ہے:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«هٰذَا بَيْنِي وَ بَيْنَ عَبْدِي وَ لِعَبْدِي مَا سَأَلَ»

''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔''

اور جب (بندہ) کہتا ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾

''دکھا ہمیں سیدھا راستہ۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«هٰذَا لِعَبْدِي وَ لِعَبْدِي مَا سَأَلَ»

''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔''[1]

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے کہا ہے کہ سورۂ فاتحہ کا آغاز ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ سے کرنا، اس امر کی دلیل ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کے آغاز میں اس کا لکھنا تبرک اور فصل کے لیے ہے۔ اس رائے کی سب سے قوی اور بڑی دلیل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا قَرَأْتُمْ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ فَاقْرَؤُوا ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ ،

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة......، حديث:395

إِنَّهَا أُمُّ الْقُرْآنِ وَأُمُّ الْكِتَابِ وَالسَّبْعُ الْمَثَانِي وَ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ إِحْدَاهَا»

''جب تم ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ پڑھو تو ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ بھی پڑھو، بے شک یہ اُم القرآن، اُم الکتاب اور سبع مثانی ہے، اور ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اس کی ایک (آیت) ہے۔''[1]

اس حدیث میں بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت بتلایا گیا ہے۔ یہ حدیث سنن دارقطنی اور سنن بیہقی میں ہے۔ علاوہ ازیں اسے محدّثِ عصر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''سِلْسِلَةُ الْأَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَة'' میں بھی نقل کیا ہے۔[2]

یہ حدیث فیصلہ کن دلیل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بعد یہ اختلاف ختم ہو جانا چاہیے۔ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ متقدمین علماء کے علم میں یہ حدیث نہیں آسکی جس کی وجہ سے انھوں نے متعارض دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف رائے قائم کی لیکن صریح نص مل جانے کے بعد بسم اللہ کو سورۂ فاتحہ کی آیت تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بسم اللہ نماز میں سرّی پڑھی جائے یا جہری؟

اسی طرح بسم اللہ کے متعلق ایک دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جن نمازوں میں جہری، یعنی بلند آواز میں قراءت ہوتی ہے، وہاں سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کے آغاز سے پہلے ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ بھی اونچی آواز سے پڑھی جائے یا نہیں؟ بعض علماء کا خیال ہے کہ سرّی نمازوں، یعنی جن نمازوں میں بلند آواز سے قراءت نہیں ہوتی ان میں سرّی اور جہری نمازوں

---

[1] سنن الدارقطني: 311/1 وسنن الكبرٰى للبيهقي: 45/2

[2] سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 1183

میں جہری پڑھی جائے۔ اس طرح دونوں قسم کی روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ علامہ شوکانی، نواب صدیق حسن خان اور ان کے علاوہ بعض دیگر علماء نے اسی رائے کو پسند کیا ہے لیکن دوسرے علماء کے نزدیک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی وہ روایات، صحت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ، خلفائے اربعہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جہری نمازوں میں قراءت کا آغاز ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ سے کرنا بتلایا گیا ہے۔[1]

نبیٔ کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سورۂ فاتحہ کی آیت ہونے کے باوجود بسم اللہ کو اونچی آواز سے کیوں نہیں پڑھا؟ اس کی حکمت یا علت کیا ہے؟ ہم اسے جان سکتے ہیں، نہ بیان کر سکتے ہیں۔ صرف آپ کے عمل کی وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بسم اللہ کا نماز میں آہستہ آواز میں پڑھنا افضل ہے، تاہم اگر کوئی اونچی آواز سے بسم اللہ پڑھتا ہے تو ایسا کرنا بھی جائز ہے اور اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔

بسم اللہ پڑھنے کا حکم

مشہور حدیث ہے:

«كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَّا يُبْدَأُ فِيهِ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ فَهُوَ أَبْتَرُ»

''ہر اہم کام جس کا آغاز بسم اللہ سے نہ کیا جائے، وہ بے برکت ہے۔''

اِس حدیث سے استدلال کر کے کہا جاتا ہے کہ ہر کام کی ابتدا سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے۔ جیسا کہ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نَيْلُ الْأَوْطَار اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے إِرْوَاءُ الْغَلِيْل میں صراحت کی ہے۔[2] ایک روایت میں ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾

---

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب مايقول بعد التكبير، حديث: 743 و صحيح مسلم، الصلاة، باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، حديث: 399 و باب ما يجمع صفة الصلاة......،حديث: 498

[2] نيل الأوطار، باب التسمية للوضوء: 161/1 و إرواء الغليل، حديث: 1

کے الفاظ ہیں، یعنی الحمد للہ کہہ کر ہر کام کا آغاز کیا جائے لیکن یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے إِرْوَاءُ الْغَلِیل میں وضاحت کی ہے۔[1]

تاہم بہت سے معاملات کے متعلق منقول ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر ان کا آغاز کیا جائے۔ جیسے وضو سے پہلے، کھانے سے پہلے، بیوی کے ساتھ ہم بستری کے وقت، گھر سے نکلتے وقت، مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت، کسی تحریر (خط یا معاہدے) کے وقت اور جانور کے ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھی جائے۔ اِس سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ ہر اہم کام سے پہلے بسم اللہ کا پڑھنا مستحب عمل ہے اوران احادیث سے جن میں مذکورہ مواقع پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم ہے، مذکورۃ الصدر مشہور اور ضعیف حدیث کی تائید ہو جاتی ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ فلاں کام بسم اللہ یا الحمد للہ یا اعوذ باللہ پڑھ کر شروع کیا جائے اس سے اصل مقصد ہر کام کے آغاز پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہے، وہ کسی طرح بھی کر لیا جائے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ قرآن پڑھتے وقت اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو اعوذ باللہ پڑھ لینا کافی ہے، بسم اللہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، سوائے سورتوں کے آغاز کے کیونکہ وہاں تو بسم اللہ تحریر ہے، اس لیے وہاں اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ بنا بریں کسی سورت سے تلاوت کا آغاز کرنا ہو تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ پڑھی جائے اور اگر کہیں درمیان سے تلاوت کرنی ہو تو صرف اعوذ باللہ پڑھ لینا کافی ہے، یعنی ﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾، اس کے معنی ہیں: ’’میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔‘‘ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾

’’جب تم قرآن پڑھو تو اللہ کی پناہ طلب کرو شیطان مردود سے۔‘‘[2]

---

[1] إرواء الغليل، حديث: 2 [2] النحل 98:16

قرآن کی اس آیت کا مفاد یہی ہے کہ پہلے اعوذ باللہ پڑھی جائے اور اس کے بعد تلاوت کا آغاز کیا جائے۔

سورۂ فاتحہ کی عظمت وفضیلت

صحیح بخاری میں ہے، سیدنا ابوسعید بن معلّیٰ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: میں مسجد (نبوی) میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا لیکن میں نے آپ کو جواب نہیں دیا۔ (نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور) میں نے کہا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:

«أَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ: ﴿اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ﴾؟

”کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اللہ اور اس کا رسول جب تمھیں بلائیں تو اُن کی پکار کا جواب دو؟“

پھر آپ نے مجھ سے فرمایا:

«لَأُعَلِّمَنَّكَ سُورَةً هِيَ أَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ»

”میں تجھے مسجد سے نکلنے سے پہلے ضرور ایسی سورت سکھلاؤں گا جو قرآن کی سورتوں میں سب سے زیادہ عظمت والی ہے۔“

پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا (اور باتیں کرتے رہے) جب آپ نے باہر نکلنے کا ارادہ فرمایا تو میں نے عرض کیا: کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ میں تجھے ایک ایسی سورت سکھلاؤں گا جو قرآن کی سب سے زیادہ باعظمت سورت ہے؟ آپ نے فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ

الَّذِي أُوتِيتُهُ»

''(وہ سورت) ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔ یہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔''[1]

جامع ترمذی اور مسند احمد میں اسی طرح کا ایک واقعہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف نکلے اور انھیں آواز دی: اے اُبی! ابی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، انھوں نے تھوڑا سا مڑ کر دیکھا لیکن جواب نہیں دیا اور نماز پڑھتے رہے، تاہم اس میں تخفیف کر دی اور پھر سلام پھیر کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا، رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

«مَا مَنَعَكَ يَا أُبَيُّ أَنْ تُجِيبَنِي إِذْ دَعَوْتُكَ؟»

''اے اُبی! جب میں نے تجھے بلایا تھا تو تجھے جواب دینے سے کس نے روکا؟''

انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:

«أَفَلَمْ تَجِدْ فِيمَا أَوْحَى اللهُ إِلَيَّ أَنِ ﴿اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾؟»

''اللہ تعالیٰ نے جو قرآن مجھ پر وحی کیا ہے، کیا اس میں یہ نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول تمھیں زندگی بخش باتوں کی طرف بلائیں تو ان کی بات کا جواب دو؟''

انھوں نے کہا: ہاں ضرور ہے، آئندہ ان شاء اللہ ایسا نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا:

«أَتُحِبُّ أَنْ أُعَلِّمَكَ سُورَةً لَّمْ يُنْزَلْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْقُرْآنِ مِثْلُهَا؟»

''کیا تو پسند کرتا ہے کہ میں تجھے ایسی سورت سکھلاؤں کہ اس جیسی سورت تورات میں

---

[1] صحيح البخاري، التفسير، باب ما جاء في فاتحة الكتاب، حديث: 4474

اتری، نہ انجیل اور زبور میں (حتی کہ) قرآن میں بھی اس جیسی دوسری سورت نہیں ہے؟''
اُبی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ہاں، اے اللہ کے رسول! (ایسی سورت ضرور سکھلائیں)۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
«كَيْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلَاةِ؟»
''تو نماز میں کس طرح قراءت کرتا ہے؟''
انھوں نے ام القرآن، یعنی سورۂ فاتحہ پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! مَا أُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْإِنْجِيلِ وَلَا فِي الزَّبُورِ وَلَا فِي الْفُرْقَانِ مِثْلُهَا، وَإِنَّهَا سَبْعٌ مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنُ الْعَظِيمُ الَّذِي أُعْطِيتُهُ»
''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تورات، انجیل اور زبور میں اس جیسی کوئی سورت نازل ہوئی ہے، نہ فرقان حمید میں۔ اور یہ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔''[1]

چند ضروری وضاحتیں

① یہ بظاہر ایک ہی قسم کا واقعہ ہے جو دو صحابہ، سیدنا ابوسعید بن معلّٰی اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے ساتھ پیش آیا لیکن چونکہ ان دونوں میں کمی بیشی ہے، اس لیے ان دونوں کو الگ الگ واقعہ قرار دیا گیا ہے۔[2]
مطلب یہ کہ ان دونوں صحابہ کے ساتھ ملتا جلتا واقعہ پیش آیا اور دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کی مذکورہ فضیلت بیان فرمائی۔

---

① جامع الترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في فضل فاتحة الكتاب، حديث: 2875 و مسند أحمد: 357/2 ② فتح الباري (دارالسلام): 197/8 و مسند أحمد: 450/3

② ان دونوں روایات میں کہا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ، سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔ اکثر شارحین نے اس میں واؤ کو عاطفہ قرار نہیں دیا ہے، یعنی سورۂ فاتحہ ہی کو سبع مثانی اور قرآن عظیم کہا گیا ہے۔ گویا جز پر کُل کا اطلاق کیا گیا ہے، یعنی سورۂ فاتحہ سے پورا قرآن مجید مراد لیا گیا ہے۔ تاہم فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسرا احتمال بھی تسلیم کیا ہے، یعنی اس کو معطوف اور معطوف علیہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ مجھے قرآن عظیم بھی دیا گیا ہے۔ ①

③ سیدنا ابوسعید بن معلّٰی رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی سات آیات، بسم اللہ کے علاوہ ہیں کیونکہ اس میں سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد للہ سے کیا گیا ہے (تاہم یہ استدلال درست نہیں جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے)۔ علاوہ ازیں اسے سبع مثانی بھی کہا گیا ہے جس کے ایک معنی بار بار دہرائی جانے والی سات آیات بھی کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض نے اسے تثنیہ سے اور بعض نے استثنا سے بھی مشتق قرار دیا ہے۔

④ اس واقعے میں نماز میں اِلْتِفَات (مڑکر دیکھنے) کا ذکر ہے، حالانکہ احادیث میں اسے اِخْتِلَاسُ الشَّیْطَان (شیطان کا چھینا) کہا گیا ہے ② جس سے اس کی کراہت واضح ہے۔ لیکن فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک یہ کراہت تنزیہی ہے، یعنی حسب ضرورت اس کا جواز ہے، نیز یہ التفات اس حد تک نہ ہو کہ اس کی گردن یا سینہ قبلے کے رخ سے بالکل ہٹ جائے۔ ③

⑤ ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار کا جواب دینا ضروری ہے، چاہے کوئی نماز ہی کیوں نہ پڑھ رہا ہو۔ تاہم اس میں اختلاف ہے کہ جواب دینے سے اس کی نماز میں کوئی کمی ہوگی، یا یہ ایک خصوصی استثنا ہے، نماز اس کے باوجود ناقص نہیں ہوگی۔ ④

---

① فتح الباري (دارالسلام):199/8 ② صحيح البخاري، الأذان، باب الالتفات في الصلاة، حديث:751 ③ فتح الباري (دارالسلام):303/2 ④ فتح الباري (دارالسلام):199/8

بہرحال دونوں روایات سے سورۂ فاتحہ کی فضیلت واضح ہے کہ یہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت ہے، نیز یہ کہ اس سے قبل اس طرح کی باعظمت سورت نازل نہیں ہوئی۔ اس اعتبار سے اس کا نزول امت محمدیہ کا ایک خصوصی شرف ہے جس سے صرف اسی کو نوازا گیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلاَ أُخْبِرُكَ بِخَيْرِ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟»

''کیا میں تجھے قرآن کی سب سے بہتر سورت نہ بتلاؤں؟''

سیدنا عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کیوں نہیں! ضرور بتلایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِقْرَإِ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ حَتّٰى تَخْتِمَهَا»

''﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کو آخر تک پڑھ۔''[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آپ نے سورۂ فاتحہ کو أَفْضَلُ الْقُرْآن سے تعبیر فرمایا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ ایک وقت جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف فرما تھے کہ انھوں نے اپنے اوپر سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ جبریل نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا:

«هٰذَا بَابٌ مِّنَ السَّمَاءِ فُتِحَ الْيَوْمَ لَمْ يُفْتَحْ قَطُّ إِلَّا الْيَوْمَ»

''یہ آسمان کا ایک دروازہ (کھلنے کی آواز) ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا۔''

تو اس سے ایک فرشتہ اُترا۔ جبریل نے فرمایا: یہ فرشتہ جو زمین پر اُترا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں اُترا۔ (فرشتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا) اور سلام کر کے عرض گزار ہوا:

---

[1] مسند أحمد:177/4 و صحيح الجامع الصغير، حديث:2592

[2] المستدرك للحاكم:560/1 و شعب الإيمان للبيهقي:444/2-445

«أَبْشِرْ بِنُورَيْنِ أُوتِيتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ، فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيمُ سُورَةِ الْبَقَرَةِ، لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِّنْهُمَا إِلَّا أُعْطِيتَهُ»

''آپ کو دونوروں کی خوش خبری ہو جو صرف آپ کو دیے گئے ہیں، آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے اور وہ ہیں، سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات، آپ ان میں سے جس ایک حرف کی بھی تلاوت کریں گے (مضمون کی مناسبت سے) وہ چیز آپ کو عطا کر دی جائے گی۔''[1]

مسئلہ فاتحہ خلف الامام

مذکورہ احادیث سے سورۂ فاتحہ کی اہمیت، عظمت اور فضیلت واضح ہے۔علاوہ ازیں اس کی اہمیت اس سے بھی واضح ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے اسے نماز میں پڑھنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»

''اس شخص کی نماز نہیں جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔''[2]

اس حدیث میں مَنْ کا لفظ عام ہے جو ہر نمازی کو شامل ہے۔منفرد ہو یا امام یا امام کے پیچھے مقتدی۔ سِرّی نماز ہو یا جہری، فرض نماز ہو یا نفل۔ ہر نمازی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔امام بخاری ؒ نے بھی اس حدیث کا جو باب باندھا ہے، وہ یہ ہے:

«بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ، وَمَا يُجْهَرُ فِيهَا وَمَا يُخَافَتُ»

---

[1] صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل الفاتحة و خواتيم سورة البقرة......، حديث:806

[2] صحيح البخاري، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها......، حديث:756و صحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، حديث:394

''تمام نمازوں میں امام اور مقتدی کے لیے قراءت ضروری ہے، سفر ہو یا حضر، جہری نماز ہو یا سرّی۔''

وجوبِ قراءت سے مراد ظاہر بات ہے سورۂ فاتحہ ہی کی قراءت کا وجوب ہے۔ تاہم کسی کو یہ نہ آتی ہو تو شریعت نے اسے رخصت دی ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کی جگہ وہ کلمات پڑھ لے جو اسی طرح کے ایک واقعے میں رسول اللہ ﷺ نے بتائے تھے، چنانچہ سنن نسائی میں ہے، سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

«إِنِّي لَا أَسْتَطِيعُ أَنْ آخُذَ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْآنِ فَعَلِّمْنِي شَيْئًا يُّجْزِئُنِي مِنَ الْقُرْآنِ»

''بے شک میں طاقت نہیں رکھتا کہ میں قرآن سے کچھ یاد کرسکوں، پس مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو مجھے قرآن سے کفایت کر جائے۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پڑھو

«سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ»

''اللہ پاک ہے، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور گناہ سے پھرنے اور نیکی کے کرنے کی طاقت اللہ بزرگ و برتر کی مدد و توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔''[1]

تاہم یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کلمات کو سورۂ فاتحہ کی جگہ مستقل پڑھا جا سکتا ہے بلکہ اس پر واجب ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سورۂ فاتحہ کو یاد کرے اور اسے ہی نماز میں پڑھے۔ صحیح مسلم کی تبویب (باب بندی) میں بھی اسی طرف

[1] سنن النسائي، الافتتاح، باب ما يجزئ من القراءة لمن لا يحسن القرآن، حديث:925

اشارہ کیا گیا ہے۔ [1]

تاہم جس کو سورۂ فاتحہ یاد ہو تو وہ اس کے علاوہ اور کچھ پڑھ لے لیکن سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو حدیث کی رو سے اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی، چاہے کوئی سی بھی نماز ہو اور چاہے امام ہو یا مقتدی۔ اس عموم کی مزید تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نمازِ فجر میں بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کریم پڑھتے رہے جس کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قراءت بوجھل ہوگئی۔ نماز ختم ہونے کے بعد جب آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ کیا تم بھی ساتھ پڑھتے رہے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا:

«لَا تَفْعَلُوا إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ، فَإِنَّهُ لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِهَا»

''تم ایسا مت کیا کرو (ساتھ ساتھ مت پڑھا کرو) البتہ سورۂ فاتحہ ضرور پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر کسی کی نماز نہیں ہوگی۔'' [2]

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہی سے ایک اور روایت دوسری سند سے آئی ہے جس میں بڑی وضاحت سے زیر بحث مسئلے کی تفصیل ہے۔ یہ طبرانی کبیر کی روایت ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الْإِمَامِ فَلْيَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»

''جو امام کے پیچھے نماز پڑھے، اسے چاہیے کہ وہ سورۂ فاتحہ پڑھے۔'' [3]

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، و إنه إذا لم يحسن الفاتحة و لا أمكنه تعلمها قرأما تيسر له من غيرها [2] جامع الترمذي، الصلاة، باب ما جاء في القراءة خلف الإمام، حديث: 311 و سنن أبي داود، الصلاة، باب من ترك القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب، حديث: 823 [3] مجمع الزوائد: 111/2 بحواله طبراني كبير۔

عہدِ رسالت میں جہری نماز میں امام کے پیچھے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قرآن پڑھنے کا واقعہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔اس میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ایسا کرنے سے منع فرمایا اور ساتھ ہی ان الفاظ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی تاکید فرمائی:

«فَلَا تَفْعَلُوا، لِيَقْرَأْ أَحَدُكُمْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي نَفْسِهِ»

''تم ساتھ ساتھ قرآن مت پڑھو، البتہ سورۂ فاتحہ تم اپنے جی میں پڑھ لیا کرو۔''[1]

مسند احمد میں ایک اور صحابی سے یہ روایت اس طرح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَعَلَّكُمْ تَقْرَؤُونَ وَالْإِمَامُ يَقْرَأُ؟ قَالَهَا ثَلَاثًا، قَالُوا: إِنَّا لَنَفْعَلُ ذٰلِكَ، قَالَ: فَلَا تَفْعَلُوا إِلَّا أَنْ يَقْرَأَ أَحَدُكُمْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي نَفْسِهِ»

''شاید تم امام کے ساتھ ساتھ پڑھتے ہو؟ تین مرتبہ آپ نے پوچھا۔صحابہ نے عرض کیا: ہاں، ہم ایسا کرتے ہیں۔آپ نے فرمایا: اس طرح نہ کیا کرو۔مگر یہ کہ تمھارا ایک آدمی اپنے جی میں سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرے۔''[2]

ان تمام روایات میں صراحت ہے کہ جب امام اونچی آواز سے قراءت کرے، جیسے مغرب، عشاء اور فجر کی نماز میں ہوتا ہے، تو مقتدی کیا کرے؟ کیا خاموش رہے؟ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔نہیں بلکہ اپنے جی میں سورۂ فاتحہ پڑھے، البتہ سورۂ فاتحہ جی میں پڑھنے کے بعد خاموش رہے اور امام کی قراءت سنے۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کو الکافیۃ بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے کفایت کر جانے والی سورت، چنانچہ تفسیر فتح القدیر میں ہے کہ عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے؟ انھوں نے کہا: کیا تو مجھ سے الکافیۃ کے متعلق پوچھ رہا ہے؟ سائل نے کہا: الکافیۃ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: سورۃ الفاتحہ، پھر فرمایا:

---

[1] رواہ ابویعلی والطبراني فی الأوسط و رجاله ثقات، مجمع الزوائد:110/2 و تاریخ بغداد:175/13-176 [2] مسند أحمد:236/4-410:5 و مجمع الزوائد:111/2

«أَ مَا عَلِمْتَ أَ نَّهَا تَكْفِي عَنْ سِوَاهَا وَ لَا يَكْفِي سِوَاهَا عَنْهَا»

''تو نہیں جانتا کہ یہ سورت اپنے سوا ہر ایک سے کافی ہوجاتی ہے لیکن اس کے سوا دوسری سورتیں اس کی طرف سے کافی نہیں ہوتیں۔''[1]

اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ صَلَّى صَلَاةً لَّمْ يَقْرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ. ثَلَاثًا. غَيْرُ تَمَامٍ»

''جس نے بغیر فاتحہ کے نماز پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہے۔''

تین مرتبہ آپ نے یہ فرمایا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا:

«إِنَّا نَكُونُ وَرَاءَ الْإِمَامِ»

''امام کے پیچھے ہم نماز پڑھتے ہیں، اس وقت کیا کریں؟''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«إِقْرَأْ بِهَا فِي نَفْسِكَ»

''امام کے پیچھے تم سورۂ فاتحہ اپنے جی میں پڑھو۔''

اس لیے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَ بَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ»

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے۔''[2]

اس حدیث میں نماز سے مراد سورۂ فاتحہ ہے کیونکہ سورۂ فاتحہ ہی کو آدھا آدھا تقسیم کیا گیا ہے، یعنی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ تک اللہ تعالیٰ کی تعریف (حمد وثنا) اور تمجید (بزرگی کا بیان) ہے۔ مطلب یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے۔ اور ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان مشترک ہے۔ اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

[1] تفسير فتح القدير ، الفاتحة:1

[2] صحيح مسلم، الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، حديث:395

﴿ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ سے ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ تک بندے کی طرف سے دعا ہے تو یہ بندے کا حصہ ہے۔

علاوہ ازیں اس حدیثِ قدسی میں سورۂ فاتحہ کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر نماز صحیح نہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہی استدلال فرما کر امام کے پیچھے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنے کو ضروری قرار دیا۔

مذکورہ احادیث سے واضح ہوا کہ قرآن مجید میں جو آتا ہے:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

''جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''[1]

یا حدیث (بشرطِ صحت):

«وَ إِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا»

''جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو۔''

کا مطلب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی سورۂ فاتحہ کے علاوہ باقی قراءت خاموشی سے سنیں، امام کے ساتھ قرآن نہ پڑھیں اور ائمہ حضرات اگر سنت نبوی کے مطابق سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں، یعنی ہر آیت پر وقف کریں جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، تو ان وقفوں میں مقتدی حضرات بآسانی سورۂ فاتحہ پڑھ سکتے ہیں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی کیفیت ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آپ ہر آیت کو قطع کر کر کے پڑھتے تھے۔ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ پڑھتے، پھر ٹھہر جاتے، پھر ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ پڑھتے، پھر ٹھہر جاتے۔[2]

اس طرح مسنون قراءت میں وقفۂ امام میں سورۂ فاتحہ پڑھی جائے یا پھر جی میں خاموشی

---

[1] الأعراف 7:204

[2] جامع الترمذي، القراء ات، باب في فاتحة الكتاب، حديث:2927 و صحيح الجامع الصغير، حديث:5000 و إرواء الغليل، حديث:343 والمستدرك للحاكم:2/231-232

سے پڑھ لیں جیسا کہ گزشتہ روایات میں صراحت ہے۔

بعض علماء کے نزدیک امام اگر سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکتہ کرے (کچھ دیر خاموش رہے) تو مقتدی اس سکتے میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھ سکتے ہیں۔ اس مسلک کی بھی تائید بعض احادیث سے ہوتی ہے، تاہم بہتر صورت پہلی اور دوسری ہی ہے۔ بہر حال اس طریقے سے آیتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ میں کوئی تعارض نہیں رہتا جیسا کہ بعض لوگ باور کراتے ہیں۔ جبکہ سورۂ فاتحہ کی ممانعت سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ خاکم بدہن قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں باہم ٹکراؤ ہے اور دونوں میں سے کسی ایک ہی پر عمل ہوسکتا ہے، بیک وقت دونوں پر عمل ممکن نہیں۔ فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا۔

مزید دیکھیے: تفسیر احسن البیان، سورۂ اعراف، آیت: 204 کا حاشیہ اور اس موضوع سے متعلقہ کتابیں، جیسے تحقیق الکلام، از مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ۔ خیر الکلام، از حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ۔ توضیح الکلام، از مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ۔ تعلیقات ترمذی، از احمد شاکر، ج: 2، ص: 124۔ المحلی، ج: 3، ص: 236-243، رقم: 360 وغیرھا من الکتب۔

سورۂ فاتحہ کی تاثیر و برکت

اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں جو شفائی تاثیر اور برکت رکھی ہے، اس سے بھی اس سورت کی فضیلت اور اہمیت واضح ہوتی ہے، چنانچہ حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ کا گزر عرب کے ایک قبیلے کے پاس سے ہوا، انھوں نے صحابہ کی مہمان نوازی نہیں کی۔ اتفاق سے اسی دوران میں قبیلے کے سردار کو بچھو یا سانپ وغیرہ نے ڈس لیا۔ وہ لوگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور پوچھا: کیا آپ لوگوں کے پاس اس کا کوئی علاج یا دم ہے؟

صحابہ نے جواب دیا: تم نے ہماری مہمان نوازی نہیں کی، اس لیے ہم اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک تم ہمارے لیے کوئی معاوضہ طے نہیں کرو گے، چنانچہ انھوں نے کچھ بکریاں دینے کا وعدہ کرلیا۔ پس صحابہ میں سے ایک شخص نے اُم القرآن (سورۂ فاتحہ) پڑھنی شروع کی، وہ منہ میں تھوک جمع کرتا اور اس پر تھتکارتا، چنانچہ ان کا سردار ٹھیک ہوگیا اور وہ بکریاں لے کر ان کے پاس آئے۔ (صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ بکریاں لے لیں لیکن) انھوں نے کہا کہ اس کی بابت ہم پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے، چنانچہ انھوں نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا:

«وَ مَا أَدْرَاكَ أَنَّهَا رُقْيَةٌ؟ خُذُوهَا وَ اضْرِبُوا لِي بِسَهْمٍ»

”تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ سورت دم ہے (اس سے دم کیا جاسکتا ہے)؟ تم یہ بکریاں لے لو اور میرے لیے بھی اس میں حصہ رکھو۔“

یعنی نبی ٔکریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اس معاوضے کو جائز قرار دیا بلکہ اپنا حصہ بھی وصول کیا۔ ایک دوسری روایت میں الفاظ ہیں کہ اس معاوضے پر بعض صحابہ نے اپنے ساتھی پر اعتراض کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ»

”بے شک جس پر تم معاوضہ لے سکتے ہو، ان میں سب سے زیادہ حق دار اللہ کی کتاب ہے۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ قبیلے والوں نے 30 بکریاں دیں اور سب صحابہ کو دودھ بھی پلایا۔[1]

---

[1] صحيح البخاري ، الطب، باب الرقي بفاتحة الكتاب، حديث: 5736 و باب الشروط في الرقية بفاتحة الكتاب، حديث: 5737 و باب النفث في الرقية، حديث:5749 و فضائل القرآن، باب فضل فاتحة الكتاب، حديث: 5007 والإجارة، باب ما يعطي في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب، حديث: 2276 وصحيح مسلم، السلام، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية بالقرآن والأذكار، حديث:2201

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی آتا ہے، خارجہ بن صلت رحمہ اللہ اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ ان کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اس شخص (محمد ﷺ) کے پاس سے خیر لائے ہیں، پس ہمارے اس آدمی کو دم کر دیں۔ اور وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ایک پاگل آدمی کو لائے، وہ اس پر صبح و شام تین دن سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرتے رہے۔ وہ سورۂ فاتحہ پڑھتے، اپنا تھوک جمع کرتے اور اس پاگل پر تھتکار دیتے، تین دن کے بعد وہ گویا رسیوں سے آزاد ہو گیا (صحیح ہو گیا)، انھوں نے اس خوشی میں انھیں کچھ چیزیں دیں، وہ یہ چیزیں لے کر نبیٔ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا یہ واقعہ بیان فرمایا، آپ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا:

«كُلْ! فَلَعَمْرِي لَمَنْ أَكَلَ بِرُقْيَةِ بَاطِلٍ، لَقَدْ أَكَلْتَ بِرُقْيَةِ حَقٍّ»

''کھا، میری زندگی کی قسم! جو لوگ باطل دم کے ذریعے سے مال کھاتے ہیں (ان کا وبال انھی پر ہے تاہم) تو نے صحیح دم کے ذریعے سے یہ چیزیں حاصل کی ہیں۔''[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ پہلے واقعے سے مختلف ہے۔[2]

علاوہ ازیں اس حدیث میں نبی ﷺ نے اپنی زندگی کی قسم کھائی ہے، حالانکہ غیر اللہ کی قسم کھانا حرام ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کا خاصّہ ہے، اس لیے آپ کے لیے تو اس کا جواز تھا لیکن کسی اور کے لیے اپنی قسم یا اولاد کی قسم یا اللہ کے سوا کسی اور کی قسم بالکل حرام ہے۔

تعلیم قرآن یا دم (جھاڑ پھونک) پر معاوضہ لینے کا مسئلہ

ان دونوں واقعات سے اکثر علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم دینے یا دم جھاڑ کرنے پر معاوضہ لینا جائز ہے، نیز قرآن کریم کے ساتھ دم کرنا بھی جائز ہے، اس لیے

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في كسب الأطباء، حديث:3420 و مسند أحمد:5:210-211

[2] فتح الباري (دارالسلام):575/4

کہ اگر یہ کام ناجائز ہوتے تو نبی ﷺ اس سے منع فرما دیتے اور معاوضہ بھی واپس لوٹانے کا حکم دیتے۔ اور بعض علماء نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں سرے سے تعلیم قرآن یا قراءتِ قرآن کا مسئلہ ہی نہیں ہے کیونکہ اہل قبیلہ نے آکر یہ نہیں کہا تھا کہ انھیں ایسا شخص مہیا کریں جو انھیں قرآن پڑھ کر سنائے یا قرآن کی تعلیم دے۔ انھوں نے تو یہ کہا تھا کہ کیا آپ لوگوں کے پاس اس کا کوئی علاج یا دم ہے؟ (ہمارے مریض کا علاج کر دیں) گویا انھوں نے ایک طبیب کا مطالبہ کیا تھا اور شفایاب ہونے پر انھوں نے علاج کا معاوضہ دیا تھا۔ علاوہ ازیں صحابہ نے بھی معاوضہ اس لیے طلب فرمایا تھا کہ ان لوگوں نے ان مسافر صحابہ کی مہمان نوازی نہیں کی تھی جو ان کا بستی والوں پر حق تھا۔ بستی والوں نے اس حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی تھی۔ اس لیے صحابہ نے پہلے معاوضہ طے کیا تاکہ اس طرح اپنا حق وصول فرمالیں۔

دوسری رائے کی تائید میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے بعض اہل صفہ کو قرآن کریم کی تعلیم دی تو ان میں سے ایک شخص نے ان کو ایک کمان بطور ہدیہ دی۔ انھوں نے سوچا، یہ کوئی مال تو نہیں ہے بلکہ ایک ہتھیار ہی ہے جس سے میں اللہ کی راہ میں تیراندازی کروں گا، تاہم انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے ضرور پوچھیں گے، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں آئے اور آکر بطور استفسار آپ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا:

«إِنْ كُنْتَ تُحِبُّ أَنْ تُطَوَّقَ طَوْقًا مِّنْ نَّارٍ فَاقْبَلْهَا»

''اگر تجھے یہ پسند ہے کہ تجھے آگ کا طوق پہنایا جائے تو اس ہدیے کو قبول کر لے۔''[1]

اس روایت کی سند میں اگرچہ کچھ کلام ہے لیکن دوسرے طرق سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے اور بحیثیت مجموعی یہ روایت صحیح قرار پاتی ہے، چنانچہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے صحیح سنن ابی داود

---

[1] سنن أبي داود، البيوع، باب في كسب المعلم، حديث: 3416

میں نقل کرنے کے علاوہ سِلسِلَةُ الأَحَادِيثِ الصَّحِيحَة میں بھی اس کی سند پر مفصل بحث کر کے اسے اور اس کے ہم معنی روایات کو صحیح کہا ہے۔[1]

لیکن دوسرے بعض علماء کے نزدیک سنن ابی داود کی یہ روایت ضعیف اور نا قابل استدلال ہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ جن علماء کی رائے میں سنن ابی داود کی مذکورہ روایت صحیح نہیں، ان کے نزدیک تو مسئلہ واضح ہے کیونکہ صحیح بخاری کی روایت سے اجرت اور معاوضہ لینا ثابت ہے لیکن جن کے نزدیک سنن ابی داود کی روایت بھی صحیح ہے تو پھر دونوں روایات میں جو تعارض ہے، اس کا دور کرنا ضروری اور جمع و تطبیق کا اہتمام لازم ہے، یعنی دونوں قسم کی روایات کی ایسی توجیہ کرنا جس سے تعارض ختم ہو جائے اور موقع و محل کے اعتبار سے دونوں پر عمل کرنا ممکن ہو۔ ہمارے خیال میں تطبیق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس معاشرے اور ماحول میں مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم کے ساتھ گہرا ہو اور ہر شخص از خود قرآن مجید کے ساتھ رغبت اور اس کو پڑھنے اور سمجھنے کا شوق رکھتا ہو تو وہاں چونکہ قرآن مجید کی تعلیم و تعلّم کے لیے زیادہ محنت اور توجہ کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہر شخص از خود ہی اپنے مذہبی فریضے کی اہمیت کو سمجھتا اور اس کی ادائیگی کا جذبہ رکھتا ہوگا، وہاں قرآن اور حدیث کے ساتھ اعتنا (تعلق) عام ہوگا۔ ایسے ماحول اور معاشرے میں محض قرآن کی تعلیم پر معاوضہ لینا جائز نہیں ہوگا۔ عہد رسالت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا معاشرہ بھی یقیناً ایسا ہی تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن پر ہدیہ لینے کو سخت ناپسند فرمایا اور اس پر سخت وعید بیان فرمائی۔

اور جہاں صورت حال اس کے برعکس ہو، مسلمان قرآن کریم سے بالکل غافل ہوں اور ان کی ساری توجہ صرف دنیاوی علوم اور فنون کی طرف ہو تو ایسے معاشرے اور ماحول میں جب تک قرآن کریم کی تعلیم و تعلّم اور تبلیغ و تدریس کے لیے خصوصی محنت نہیں کی جائے گی، اس

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 256 و إرواء الغليل: 1493

وقت تک مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم اور قرآنی تعلیمات کے ساتھ برقرار رکھنا نہایت مشکل ہوگا، جیسے آج کل بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں مسلمانوں کا قرآن کریم اور اسلام کے ساتھ تعلق بالکل واجبی سا ہے اور وہ بھی ان مساجد اور مدارس دینیہ کی وجہ سے ہے جن میں علماء معاوضہ لے کر قرآن اور حدیث کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر آج یہ فتویٰ دے دیا جائے کہ قرآن اور حدیث کی تعلیم پر معاوضہ لینا حرام ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ علماء جو رات دن قرآن مجید کی تعلیم و تدریس یا تبلیغ و دعوت میں مصروف ہیں اور جن کی مساعی (کوششوں) کی بدولت معاشرے میں کچھ نہ کچھ اسلامی جذبات موجود اور اسلامی اقدار و روایات کا تصور زندہ ہے، انھیں تعلیم و تبلیغ کا یہ سلسلہ موقوف کر کے کوئی اور ذریعۂ معاش اختیار کرنا پڑے گا، اور خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ مسلمانوں کا کتنا تعلق قرآن اور اسلام کے ساتھ باقی رہ جائے گا؟ اس معاشرے اور ماحول کے پیش نظر یقیناً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جن علماء نے اپنے آپ کو قرآن اور حدیث کی تعلیم و تدریس یا تبلیغ و دعوت کے لیے وقف کیا ہوا ہے، ان کا معاوضہ لے کر بھی یہ کام کرنا ایک بڑا جہاد ہے، چہ جائیکہ اس معاوضے کو حرام قرار دے کر اس سلسلۂ خیر کو ختم کرنے کی اور مسلمانوں کا تعلق قرآن کریم سے بالکل منقطع کرنے کی سعی کی جائے۔

اس موقف کی تائید خود رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل سے بھی ہوتی ہے کہ جب بستی والوں نے مسافر صحابہ کی مہمان نوازی نہیں کی تو آپ نے ان سے معاوضہ لینے کی نہ صرف تحسین کی بلکہ اسے بہترین معاوضہ قرار دیا جس سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ بعض احکام و مسائل میں حالات و ظروف (زمان و مکان) کا بھی اعتبار ہوتا ہے، تاہم اس کا فیصلہ علمائے ربانی ہی کر سکتے ہیں جن کے دل ایمان و تقویٰ سے اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی سے معمور ہوں۔ اس کی دوسری شرعی نظیر یہ ہے کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مؤذن کے متعلق

فرمایا ہے کہ ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو اذان پر اجرت نہ لے۔[1]

لیکن آج پورے عالم اسلام میں اس کے برعکس تنخواہ دار مؤذن مقرر ہیں اور علماء نے اسے بھی اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں قبول کرلیا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو مسجدوں کی حفاظت ونگرانی اور بروقت اذانوں کا اہتمام بہت مشکل ہوتا۔ اسی مشکل کے پیش نظر علمائے اسلام نے اس مسئلے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے عمومی مفاد کی خاطر لچک کا مظاہرہ کیا ہے۔

ایک اجتہادی مثال

اس کی ایک اجتہادی مثال زکاۃ کے مصارف میں ''فی سبیل اللہ'' کا مفہوم ہے۔ جمہور علماء اسی بات کے قائل چلے آرہے ہیں کہ اس سے مراد جہاد، یعنی اللہ کے راستے میں لڑنا ہے جبکہ بعض علماء اس میں وسعت کے قائل ہیں اور وہ اس سے ہر کار خیر مراد لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک ہر رفاہی اور بھلائی کے کام میں زکاۃ کی رقم استعمال ہوسکتی ہے، تاہم دلائل کے اعتبار سے جمہور علماء کا موقف صحیح ہے کیونکہ قرآن میں یہ مصارف ﴿إِنَّمَا﴾ کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔[2] اور یہ لفظ تحدید اور حصر کا تقاضا کرتا ہے، اگر فی سبیل اللہ کو عام کردیا جائے تو یہ حصر بے معنی ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض جدید علماء نے، جو جمہور ہی کی رائے کو صحیح قرار دیتے ہیں، جہاد کے مفہوم میں وسعت پیدا کرکے اسلام کی تعلیم وتبلیغ، دعوت اور اس کی نشر واشاعت وغیرہ کی تمام کوششوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان کے نزدیک مدارسِ دینیہ، دینی کتابوں کی نشر واشاعت، دینی رسائل ومجلّات اور کفار کی جیلوں میں قید بے کس اور بے سہارا علماء وداعیانِ اسلام پر زکاۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے اور یہ فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل ہے۔[3]

---

[1] إرواء الغليل، حديث: 1492 [2] التوبة 60:9

[3] تفصیل کے لیے دیکھیے: فقه الزكاة للقرضاوي، بحث مصارف زکاۃ۔

اسی نقطۂ نظر سے، جس کی ہم وضاحت کر رہے ہیں، نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے فی سبیل اللہ کے مفہوم میں علمائے دین کو بھی شامل کیا ہے، چاہے وہ مال دار ہی ہوں۔ اور کہا ہے کہ ان پر زکاۃ کی رقم خرچ کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ اہم تر ہے کیونکہ ان کے ذریعے ہی سے دین اسلام کا تحفظ اور شریعت کی بقا ممکن ہے، چنانچہ الرَّوضَةُ النَّدِيَّة میں لکھتے ہیں:

«وَ مِنْ جُمْلَةِ سَبِيلِ اللهِ الصَّرْفُ فِي الْعُلَمَاءِ الَّذِينَ يَقُومُونَ بِمَصَالِحِ الْمُسْلِمِينَ الدِّيْنِيَّةِ، فَإِنَّ لَهُمْ فِي مَالِ اللهِ نَصِيبًا، سَوَاءً كَانُوا أَغْنِيَاءَ أَوْ فُقَرَآءَ، بَلِ الصَّرْفُ فِي هٰذِهِ الْجِهَةِ مِنْ أَهَمِّ الْأُمُورِ لِأَنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَ حَمَلَةُ الدِّينِ وَ بِهِمْ تَحْفَظُ بَيْضَةُ الْإِسْلَامِ وَ شَرِيعَةُ سَيِّدِ الْأَنَامِ»

"فی سبیل اللہ کے تمام مصارف میں سے ایک مصرف علماء کا ہے جو مسلمانوں کی دینی مصلحتوں اور ضروریات کا انتظام کرتے ہیں، ان کے لیے بھی اللہ کے مال میں حصہ ہے، چاہے وہ مال دار ہوں یا فقیر، بلکہ اس مصرف پر خرچ کرنا بہت زیادہ اہم ہے کیونکہ علماء انبیاء کے وارث اور دین کے علم بردار ہیں، انھی سے اسلام اور سردارِ کائنات کی شریعت کی حفاظت ہوتی ہے۔"[1]

ارباب مساجد و مدارس کے طرزِ عمل میں اصلاح کی ضرورت

اسی زیرِ بحث حکمتِ عملی اور مصلحتِ دینی کے پیش نظر، دینی مدارس اور مساجد کے منتظمین کا روّیہ بھی اصلاح اور غور کے قابل ہے۔ جو حضرات دینی مدارس کا قیام عمل میں لاتے ہیں یا مساجد کی تعمیر اور ان کا انتظام کرتے ہیں یا ان میں تعاون کرتے ہیں، بلاشبہ یہ بات ان کے ایمان اور تقویٰ کی علامت اور خدمتِ دین کے جذبے سے سرشار ہونے کی مظہر ہے لیکن عام طور پر ابھی تک مدارس دینیہ میں پڑھانے والے اساتذہ اور مساجد کے ائمہ اور خطباء کی

[1] الروضة الندية (دارالكتب العلميه):271/1

تنخواہیں، دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کام کرنے والوں کی تنخواہوں کے مقابلے میں انتہائی حقیر اور بہت تھوڑی ہیں جس کی وجہ سے کھاتے پیتے اور متوسط گھرانے کے بچے دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے، نہ ان کے والدین ہی ان کو اس طرف آنے دیتے ہیں حتی کہ خود دینی مدارس کا انتظام کرنے والے بھی اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے میں، ان کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے تأمل کرتے ہیں، چنانچہ وہ ایک طرف مدرسوں کا انتظام کرتے ہیں لیکن دوسری طرف اپنے بچوں کو اس بہترین تعلیم سے بالکل محروم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کی وجہ اس کے علاوہ کوئی نہیں کہ دینی مدارس اور مساجد سے وابستہ علماء کی تنخواہیں اور دیگر مراعات بہت قلیل ہیں۔ وہ آج بھی، جبکہ مہنگائی عروج پر ہے اور زندگی کی آسائشوں نے ضروریاتِ زندگی کی سی اہمیت حاصل کر لی ہے، نہایت قلیل یا تھوڑے مشاہروں پر کام کر رہے ہیں۔ اور یہ دینی مدارس اور مساجد کا انتظام کرنے والے اپنے بچوں کو اس ''امتحان'' میں ڈالنا پسند نہیں کرتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ علماء تو لشٹم پشٹم (کسی نہ کسی طرح) اپنا وقت دین کی خدمت میں گزار دیتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو اپنی دینی مسند کا وارث اور جانشین نہیں بناتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ معاشرے نے انھیں وہ مقام اور مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ ٹھیک طور پر مستحق تھے۔ بعض علماء اگر کوشش بھی کرتے ہیں تو بچوں کی مائیں یا خود بچے اس معاملے میں ان سے تعاون نہیں کرتے کیونکہ ان کے سامنے اپنے شوہروں اور باپوں کی صورت حال اور کسمپرسی ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دینی مدارس میں کچھ ذہین لڑکے آجاتے ہیں تو وہ پڑھنے کے دوران ہی میں یا بعد میں دنیاوی تعلیم حاصل کر کے یا کوئی نہ کوئی دنیاوی کورس کر کے اپنی لائن بدل لیتے ہیں اور مساجد و مدارس سے وابستگی کو بہتر مستقبل کا آئینہ دار تصور نہیں کرتے۔ جیسے صدر ضیاء الحق کے دور میں دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء کو یہ سہولت دی گئی کہ اسکولوں میں وہ بطور ٹیچر ملازمت کر سکتے ہیں یا میٹرک کی سند کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں تو نئے

نئے فارغ ہونے والے علماء کی ایک بہت بڑی تعداد اسکولوں سے وابستہ ہوگئی بلکہ بہت سے ادھیڑ عمر کے علماء بھی کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے ''ٹیچر'' بننے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اسی طرح جب وفاق کی سند کو ایم اے کے برابر قرار دینے کا اعلان کیا گیا تو یونیورسٹیوں کے اربابِ بست وکشاد (اصحابِ اختیار) نے اگرچہ اس فیصلے کو خوش دلی سے تسلیم نہیں کیا لیکن بعض جگہ اس اعلان (نوٹیفکیشن) کی وجہ سے انھیں ہتھیار بھی ڈالنے پڑے اور اس طرح کچھ علماء کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زینت بن گئے۔

یوں اول تو معاشرے کا جوہر قابل اور معزز سمجھے جانے والے گھرانوں اور خاندانوں کے بچے دینی مدارس کا رخ ہی نہیں کرتے حتی کہ کوئی بچہ اگر دینی مدارس کا رخ کرنا بھی چاہے تو اسے جبراً روک دیا جاتا ہے۔ دوسرا اگر کوئی ذہین بچہ اور جوہر قابل مدرسے میں آ بھی جاتا ہے تو وہ فارغ ہوکر یا دوران تعلیم ہی میں اپنا رخ اور اپنا مقصد زندگی بدل لیتا ہے اور پھر انھی مادیت کی تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے جس میں ساری قوم ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ نتیجتاً دینی مدارس سے فارغ ہونے والی کھیپ میں، جو دینی خدمت ہی کے کسی دائرے سے وابستہ رہنے کی خواہش مند ہوتی ہے، اپنے دینی جذبے کی وجہ سے یا کسی دوسری اہلیت کے فقدان کی وجہ سے، اس میں نہ کوئی تدریس کے قابل ہوتا ہے، نہ امامت اور خطابت کی صلاحیت سے بہرہ ور اور نہ تصنیف وتالیف اور انشاء وتحریر کے ذوق سے آشنا۔ إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔

حالانکہ اس وقت اسلام کو مغرب اور اس کی ملحدانہ تہذیب اور سائنس سے شدید خطرہ ہے، اس کے مقابلے کے لیے ایسے قابل جواہر کی بڑی ضرورت ہے جو دینی علوم میں رسوخ اور مہارت حاصل کر کے اس کی سیاسی وتہذیبی یلغار کو بھی روکیں اور اس کے سائنسی علوم کی برتری کو بھی چیلنج کریں جس کی بنیاد ہی پر اس کی حیا باختہ تہذیب اور بے دین سیاسی فکر پورے عالم میں فروغ پا رہی ہے حتی کہ پوری اسلامی دنیا بھی اس کی لپیٹ میں اور اس کے سحر کے افسوں میں گرفتار ہے۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اس صورت حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایسی صورتیں اختیار کی جاتیں جن سے دینی تعلیم کو فروغ ملتا اور دینی علوم میں مہارت اور رسوخ حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی ہوتی تاکہ ذہین افراد اور جوہر قابل بھی اس طرف آتے اور معزز گھرانوں کے چشم و چراغ بھی دینی مسندوں اور منبر و محراب کو رونق بخشتے۔ اور یوں علماء کا وقار اور احترام بھی بحال ہوتا، دینی قدروں اور جذبوں کو بھی فروغ ملتا اور مغرب کے جدید چیلنج کا مقابلہ بھی کیا جا سکتا۔

یاد رکھیے! جب تک معزز سمجھے جانے والے خاندانوں کے افراد دینی علوم سے بہرہ ور ہوکر دینی مناصب کو اختیار نہیں کریں گے، اس وقت تک معاشرے میں نہ دین کا وقار بحال ہوگا نہ اہل دین کا، اور جب اپنے ہی معاشرے میں دین اور اہل دین بیگانہ ہوں گے تو اس چیلنج کا مقابلہ کون کرے گا جو دین اسلام کو اس وقت درپیش ہے؟ جبکہ اس چیلنج کا مقابلہ کیے بغیر نہ تو اسلام محفوظ ہے اور نہ عالم اسلام کا وقار ہی محفوظ ہے۔

پس چہ باید کرد

اس کا حل اور علاج یہی ہے کہ مدارس اور مساجد کے منتظمین اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کریں، وہ لاکھوں روپیہ سالانہ مدرسوں کی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں، اور یوں کروڑوں روپیہ سالانہ مدارس اور مساجد پر خرچ ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا انتظام فرما رہا ہے، اگر وہ اپنے لاکھوں کے بجٹ میں تھوڑا سا اضافہ کرکے اپنے مدارس اور مساجد سے وابستہ علماء کی تنخواہوں، مراعات اور رہائش وغیرہ کا بھی معقول انتظام کردیں تو یقیناً اس کا بھی انتظام اللہ تعالیٰ فرما دے گا۔ ان کے اس اقدام سے یقیناً علماء کی حوصلہ افزائی اور دینی علوم کی قدر افزائی ہوگی۔ اور دینی علوم کی یہ قدر افزائی جیسے جیسے عام ہوگی، ویسے ویسے جو ہر قابل بھی

اس طرف رخ کریں گے اور معزز گھرانوں کے نونہال بھی اس تعلیم سے نہال ہوں گے اور اس سے دینی اقدار و روایات کو بھی فروغ حاصل ہوگا اور پھر ان ہی میں سے ایسے دیدہ ور بھی پیدا ہوں گے جو عصر حاضر کے سیاسی، فکری اور تہذیبی چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔

لفظ سُوْرَةٌ کا معنی

بعض کے نزدیک لفظ سورۃ اصل میں ہمزہ کے ساتھ سُؤْرَةٌ ہے جس کے معنی باقی ماندہ کے ہیں، جیسے سُؤْرُالشَّرَابِ (بچا ہوا مشروب)، سُؤْرُالْھِرَّةِ (بلی کا جوٹھا، بچا ہوا) وغیرہ۔ اور باقی ماندہ چیز، ہر چیز کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ گویا ہر سورت قرآن کا ایک حصہ، اس کا بعض اور ایک قطعہ (ٹکڑا) ہے۔ اس لفظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے آخر سے ہمزہ ختم ہوگیا۔ بعض کے نزدیک یہ سُوْرُالْبَلَد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''شہر کی فصیل''۔ مطلب یہ کہ جیسے شہر کی فصیل بلند ہوتی ہے، اسی طرح قرآن مجید کی ہر سورت بلند شان اور بلند مرتبے کی حامل ہے یا جیسے فصیل پورے شہر کا احاطہ کیے ہوتی ہے، اسی طرح سورت بھی اپنے مضامین کو محیط ہوتی ہے۔ اسی سے سِوَارٌ کا لفظ بنا ہے جس کے معنی ہیں ''کنگن'' جو بازو کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک یہ تَسَوُّر سے مشتق ہے جس کے معنی ہی بلندی کے ہیں۔ قرآن کریم کلام الٰہی ہونے کے اعتبار سے نہایت بلند اور عظیم المرتبت ہے، اس کی ہر سورت بھی علو مراتب میں ممتاز ہے۔[1]

قرآن کریم کی کل 114 سورتیں ہیں۔ ان کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے، یعنی خود رسول اللہ ﷺ کی بتلائی ہوئی ہے۔ گویا یہ ترتیب نزولی (اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ) ہے، نہ کہ صحابہ کی اپنی سمجھ کے مطابق۔ رسول اللہ ﷺ ہی نے بتلایا ہے کہ فلاں سورت فلاں

---

[1] تفسیر روح المعاني، الفاتحة:69/1 و تفسیر أیسر التفاسیر، الفاتحة:1

آیت پر ختم ہوگئی ہے اور فلاں آیت سے فلاں سورت شروع ہوتی ہے۔ اوراسی طرح اس کی موجودہ ترتیب کا معاملہ ہے۔

الفاتحہ کا معنیٰ

فاتحہ کے معنی ہیں، ابتدا یا افتتاح کرنے والی، یعنی جس چیز سے کسی کی ابتدا کی جائے، وہ اس کی فاتحہ ہوگی۔ اس سورت کو فَاتِحَةُ الْكِتَاب بھی کہا جاتا ہے کیونکہ قرآن کریم کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ مصحف میں سب سے پہلے یہی درج ہوتی ہے اور پڑھنے والا سب سے پہلے اسی کو پڑھتا ہے۔

مکی یا مدنی سورت کا مطلب

سورۂ فاتحہ مکی ہے۔ مکی یا مدنی کا مطلب یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرت (13 نبوت) سے قبل نازل ہوئیں، جبکہ نبی ﷺ کا قیام مکہ میں تھا، وہ مکی کہلاتی ہیں، خواہ ان کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا یا اس کے اطراف و جوانب میں۔ اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، جبکہ نبیٔ اکرم ﷺ نے دارالھجرۃ مدینہ منورہ کو اپنا مستقل مسکن بنالیا تھا، وہ مدنی کہلاتی ہیں، خواہ وہ مدینہ یا اس کے اطراف میں نازل ہوئیں یا اس سے دور حتی کہ مکہ اور اس کے اطراف ہی میں کیوں نہ نازل ہوئی ہوں۔

سورۂ فاتحہ کے نام اوران کا معنی ومفہوم

سورۂ فاتحہ کے متعدد نام ہیں، بعض مفسرین نے 20 یا اس بھی زائد نام ذکر کیے ہیں لیکن احادیث سے اس کے صرف یہ نام معلوم ہوتے ہیں:

① اَلْفَاتِحَة: اس کے معنی ہیں ''کھولنے والی۔'' کیونکہ قرآن کریم کا آغاز اس سورت سے

ہوتا ہے، اس لیے اسے فاتحہ کہتے ہیں۔ گویا یہ قرآن مجید کا دیباچہ یا حرفِ آغاز ہے۔

② اَلسَّبْعُ الْمَثَانِي: اس کے معنی ہیں ''سات بار بار دہرائی جانے والی۔'' کیونکہ یہ سورت نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے، اس لیے اسے اَلسَّبْعُ الْمَثَانِي بھی کہتے ہیں۔

③ أُمُّ الْكِتَاب یا أُمُّ الْقُرْآن: عربی میں ام کے معنی ہیں ''ماں''۔ جس طرح ماں اپنی اولاد کی اصل اور بنیاد ہوتی ہے، اسی طرح سورۂ فاتحہ بھی قرآن کریم میں بیان کردہ مضامین کی بنیاد اور اصل ہے، اس میں عقائد بھی ہیں اور عبادات بھی، شرائع بھی ہیں اور قصص بھی، گویا کوزے میں دریا بند ہے۔ یا سورۂ فاتحہ متن اور قرآن کریم اس کی شرح ہے۔

④ اَلْقُرْآنُ الْعَظِيم: اس کا مفہوم بھی أم القرآن جیسا ہے۔

⑤ اَلصَّلَاة: اس کے معنی ہیں ''نماز''۔ کیونکہ اس سورت کے پڑھے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی، اس لیے اسے اَلصَّلَاة بھی کہتے ہیں۔

⑥ اَلشِّفَاء اور اَلرُّقْيَة: یہ نام ان واقعات سے ماخوذ ہیں جن میں اس سے دَم کرنے سے شفایاب ہونے کا ذکر ہے۔

⑦ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِين: جیسا کہ بعض روایات میں بیان ہوا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے

حمد کا معنی و مفہوم

﴿ اَلْحَمْدُ ﴾ میں الف لام، استغراق یا اختصاص کے لیے ہے، یعنی تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، یا اس کے لیے خاص ہیں۔ کیونکہ تعریف کا اصل مستحق اور سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، کسی کے اندر کوئی خوبی، حسن یا کمال ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے، اس لیے حمد (تعریف) کا مستحق بھی وہی ہے۔ علاوہ ازیں مخلوق پر اس کے احسانات بھی اتنے عام

اور بے حساب ہیں کہ وہ حیطۂ شمار سے باہر ہیں۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾

''اور تمھیں ہر وہ چیز دی جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو انھیں شمار نہیں کر سکتے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے۔''[1]

اس اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اسی کی تعریف کی جائے اور تشکر و احسان مندی کے تمام جذبات اسی کے لیے وقف کیے جائیں۔ یوں گویا اللہ تعالیٰ سرچشمۂ کمالات اور مجمع صفات بھی ہے اور مصدر احسانات و مخزن فیوضات بھی۔ اسی لیے نبیٔ اکرم ﷺ نے ایک دعا کی ابتدا میں، جو جنگ احد میں مانگی گئی، فرمایا تھا:

«اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ»

''اے اللہ! تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔''[2]

(اللّٰہ) یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے، اس کا استعمال کسی اور کے لیے جائز نہیں (جیسا کہ بسم اللہ کی تفسیر میں وضاحت گزر چکی ہے)۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ یہ کلمۂ شکر ہے جس کی بڑی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ ایک حدیث میں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کو أَفْضَلُ الذِّكْر اور اَلْحَمْدُ لِلّٰه کو أَفْضَلُ الدُّعَاء کہا گیا ہے۔[3]

ایک روایت میں ہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ»

''الحمد للّٰہ میزان کو بھر دیتا ہے۔''[4]

---

① ابراهيم 14:34 ② مجمع الزوائد:121/6

③ جامع الترمذي، الدعوات، باب ماجاء أن دعوة المسلم مستجابة، حديث:3383

④ صحيح مسلم، الطهارة، باب فضل الوضوء، حديث:223

یعنی اس کے پڑھنے کی یہ فضیلت ہے کہ اس سے ترازو بھر جاتی ہے۔ اسی لیے ایک اور حدیث میں آتا ہے:

«إِنَّ اللهَ لَيَرْضٰى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَّأْكُلَ الْأَكْلَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا أَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدَهُ عَلَيْهَا»

''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ ہر کھانے اور پینے پر بندہ اس کی حمد کرے۔''[1]

ممدوح کی تعریف و توصیف کے لیے حمد کے علاوہ مدح، ثنا اور شکر کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں باہم فرق ہے کہ حمد کا اطلاق اختیاری صفات پر ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے لطف و احسان اور اس کے رحم و کرم پر اس کی حمد کی جاتی ہے۔ مدح، اختیاری اور اضطراری دونوں صفات پر کی جاتی ہے، جیسے انسان کی اس کے حسن و جمال پر مدح کی جاتی ہے جو اس کا اختیاری فعل نہیں ہے اور اسی طرح وہ کسی کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتا ہے تو اس کی مدح کی جاتی ہے اور یہ اس کا اختیاری فعل ہے۔ ثنا کا اطلاق بار بار تعریف کرنے پر ہوتا ہے۔ شکر کا لفظ، مُنعِم و مُحسِن کے احسان و کرم پر، زبان سے اس کی تعریف و توصیف کرنے پر بولا جاتا ہے۔[2]

لفظ رب کی وضاحت

﴿ رَبِّ ﴾ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی ہیں، ہر چیز کو پیدا کر کے اس کی ضروریات مہیا کرنے والا اور اس کو تکمیل تک پہنچانے والا۔ لفظِ رب کا استعمال بغیر اضافت کے کسی اور کے لیے جائز نہیں، یعنی مطلقاً رب کا لفظ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے لیے نہیں بولا جا سکتا، البتہ اضافت کے ساتھ جائز ہے، جیسے رَبُّ الْبَيْتِ، رَبُّ الْمَالِ وغیرہ کیونکہ اس صورت میں اس کے معنی صاحب (مالک) کے ہوتے ہیں۔ رَبُّ الْبَيْتِ، یعنی

---

[1] صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب استحباب حمد الله تعالى بعد الأكل والشرب، حديث: 2734 [2] تفسير أيسر التفاسير، الفاتحة: 1

صَاحِبُ الْبَيْتِ، مطلب یہ کہ گھر والا یا گھر کا مالک اور رَبُّ الْمَالِ، یعنی صَاحِبُ الْمَالِ، مطلب یہ کہ مال والا یا مال کا مالک۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ محدود معنی و مفہوم میں رب کی اضافت انسانوں کی طرف ہوسکتی ہے لیکن غیر محدود معنی و مفہوم میں اس کا استحقاق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

الْعٰلَمِيْنَ کا مفہوم

﴿الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ عالَم کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ''جہان''۔ ویسے تو تمام مخلوقات کے مجموعے کو عالَم کہا جاتا ہے، اسی لیے اس کی جمع نہیں لائی جاتی لیکن یہاں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کے اظہار کے لیے عالَم کی بھی جمع لائی گئی ہے جس سے مراد مخلوقات کی الگ الگ جنسیں ہیں، مثلاً: عالَمِ جِنّ، عالَمِ اِنس، عالَمِ ملائکہ اور عالَمِ وُحوش وطُیور وغیرہ۔ ان تمام مخلوقات کی ضرورتیں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں لیکن ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سب کی ضروریات، ان کے احوال وظروف اور طبائع واجسام کے مطابق مہیا فرماتا ہے۔

عالَمِ اِنس: انسانوں کا جہان ہے۔ اس کی ضروریات کا آغاز ماں کے پیٹ سے ہوتا ہے، انسان نو مہینے رحِمِ مادر میں رہتا ہے۔ وہاں کسی کے بس میں نہیں کہ اِس جنین (ماں کے پیٹ کے اندر بچے) کو خوراک پہنچا سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ربوبیت ہے کہ ماں جو کچھ کھاتی پیتی ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ اس بچے کو بھی غذا فراہم کرتا ہے جس سے اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ پورے نو مہینے اس تہ در تہ اندھیری کوٹھری میں وہ رہتا اور خوراک پاتا ہے جہاں اس کے لیے کسی روشنی کا انتظام ہے، نہ ہوا کا لیکن اللہ تعالیٰ نہ صرف اسے زندہ رکھتا ہے بلکہ اس کی نشو ونما بھی کرتا ہے اور مکمل شکل میں اسے باہر نکالتا ہے۔ جب یہ ماں کے پیٹ سے اس عالَمِ رنگ و بو میں آتا ہے تو کچھ کھانے کے قابل نہیں ہوتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کی ماں کی چھاتی سے اس کے لیے دودھ کی شکل میں ایک زود ہضم غذا کا انتظام فرمادیتا ہے، پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے، اس کی ضروریات وحاجات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا

ہے، اللہ تعالیٰ اس کے مطابق اسے اشیاء اور اسباب و وسائل زندگی سے نوازتا ہے حتی کہ ضروریات سے بڑھ کر لذات اور مباحات کا بھی ایک وسیع سلسلہ اس کے سامنے ہوتا ہے جس سے انسان حسب استطاعت متمتع اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان جتنا زیادہ کسی چیز کا محتاج ہے، اسی کے مطابق وافر مقدار میں اسے مہیا فرماتا ہے۔ جیسے ہوا انسانی زندگی کے لیے ناگزیر چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اتنا عام رکھا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ انسان اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد پانی ہے، انسان اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا کیونکہ پانی ہی سے اللہ تعالیٰ انسان کی ہر ضرورت پیدا فرماتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تہ میں بھی پانی کے ذخیرے رکھ دیے ہیں۔ انسان حسبِ ضرورت واقتضا ان ذخیروں سے استفادہ کرتا ہے۔ زمین کی سطح پر بڑے بڑے سمندر ہیں اور برف پوش پہاڑ اور جھیلیں ہیں، جو دریاؤں اور نہروں کے سرچشمے ہیں، انسان ان سے بھی اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، پھر اس کے علاوہ پانی کا ایک آسمانی سلسلہ ہے، اللہ تعالیٰ وہاں سے موسلا دھار بارش برسا کر کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتا، گرمی کی شدت کو ٹھنڈک میں تبدیل کرتا اور ان علاقوں تک کو پانی مہیا کرتا ہے جہاں نہروں اور دریاؤں کا سلسلہ نہیں ہوتا۔ وعلی ہٰذا القیاس انسان کی جتنی بھی ضرورتیں اور طبعی تقاضے ہیں، ان سب کا ایسا وسیع پیمانے پر انتظام ہے کہ زبان و بیان کا کوئی اسلوب اور انشا و تعبیر کا کوئی پیمانہ اسے بیان کرنے پر قادر نہیں۔ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت کے لیے وقف اور مسخر ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً﴾

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، ان سب کو تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے اور اس نے تم کو اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے کامل طور پر نوازا ہے۔''[1]

---

[1] لقمان 20:31

اس آیت میں لفظ سَخَّرَ ، تسخیر سے ماخوذ ہے۔ تسخیر کا ایک مطلب انتفاع (فائدہ اٹھانا) یا کام میں لگا دینا ہے۔ جیسے آسمانی مخلوق چاند، سورج، ستارے وغیرہ ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے ایسے ضابطوں کا پابند بنا دیا ہے کہ یہ انسانوں کے لیے کام کر رہے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ زمینی مخلوق نہریں، کشتیاں اور جہاز وغیرہ ہیں، انسان ان سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تسخیر کا دوسرا مطلب، تابع بنا دینا ہے، چنانچہ بہت سی زمینی مخلوق کو انسان کے تابع بنا دیا گیا ہے جنھیں انسان اپنی حسبِ منشا استعمال کرتا ہے، جیسے حیوانات اور زمین کی بہت سی اشیاء ہیں۔ انسان مختلف طریقوں سے ان میں تصرف کرتا اور ان سے فیض یاب ہوتا ہے۔ گویا تسخیر کا مفہوم یہ ہوا کہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں انسانوں کے فائدے کے لیے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ چاہے وہ انسان کے تابع اور اس کے زیر تصرف ہوں یا اس کے تصرف اور اس کے تابع ہونے سے بالا ہوں۔ اسی طرح ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جن کا ادراک عقل اور حواس وغیرہ سے ممکن ہو اور باطنی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں جن کا ادراک اور احساس انسان کو نہیں۔ یہ دونوں قسم کی نعمتیں اتنی ہیں کہ انسان ان کو شمار نہیں کر سکتا۔

یہ تو عالمِ انس کی وہ مختصر سی تفصیل ہے جس کا تعلق ربوبیت باری تعالیٰ سے ہے۔ اسی طرح عالمِ جن ہے، عالمِ ملائکہ ہے، عالمِ وحوش و طیور ہے، عالمِ جمادات اور نباتات ہے اور بے شمار عالَم ہیں، ان سب کی ضروریات اور تقاضے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کی ضروریات کو جانتا اور ان کا انتظام فرماتا ہے کیونکہ وہ ربُّ العالمین ہے، تمام جہانوں کا پروردگار اور پالنہار ہے۔ اور جو رب اتنی وسیع و عریض کائنات کا مالک اور مربی ہے، یقیناً وہی اس بات کا مستحق ہے کہ زبان اس کی تعریف اور توصیف میں لگی رہے اور دل اس کی یاد میں مصروف اور اس کی بارگاہِ نیاز میں جھکے رہیں۔

انسان اس ربوبیت کا احساس اور اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد اور ثنا کرے یا نہ کرے لیکن کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ﴾

''ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتی ہے۔''[1]

گویا اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس کی حمد وثنا خوب کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح متعدد مواقع پر بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے، اسی طرح بہت سے مقامات پر الحمد للہ پڑھنے کی بھی تاکید کی گئی ہے، جیسے خطبے کا آغاز الحمد للہ سے ہوتا ہے اور یہ خطبہ بھی نکاح اور ہر حاجت کے موقع پر پڑھنا مستحب ہے۔ بیداری کے وقت، کھانا کھانے کے بعد، چھینک آنے پر، بھلائی پانے پر، اچھا خواب دیکھنے پر اور ہر دفعہ کھانے پینے پر اور دیگر بعض موقعوں پر الحمد للہ پڑھنے کا یا ایسی دعا پڑھنے کا حکم ہے جس کا آغاز الحمد للہ سے ہوتا ہے (جیسا کہ مذکورہ مواقع کی بہت سے دعاؤں میں ہے جس کی تفصیل کتب احادیث کی کتاب الدعوات میں دیکھی جا سکتی ہے)۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے

رحمٰن اور رحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کے زیادہ سے زیادہ اظہار کے لیے ان دونوں کو ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ (اس کی تفصیل بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے)۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

مالک ہے جزا کے دن کا

لفظ دین کا معنی ومفہوم

دین کے ایک معنی قانون اور مذہب کے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾

''دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''[2]

[1] بنی إسرائیل 44:17 [2] آل عمران 19:3

اسی طرح فرمایا:

﴿ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾

''جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرتا ہے، وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔''[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے سامان میں سے جب بادشاہ کا وہ پیالہ ملا جو جان بوجھ کر ان کے سامان میں رکھا گیا تھا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ یوسف کو یہ تدبیر ہم نے سُجھائی تھی کیونکہ بادشاہ کے دین کی رو سے وہ اس کے بغیر اپنے بھائی کو روک نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾

''وہ اس بادشاہ کے قانون کی رو سے تو اپنے بھائی کو نہیں رکھ سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''[2]

ان سب مقامات میں دین قانون اور مذہب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

دین کے دوسرے معنی ہیں، جزا اور بدلہ۔ یہاں سورۂ فاتحہ میں یہی معنی مراد ہیں۔ قیامت کے دن کو یہاں روز جزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

روزِ قیامت کے مختلف نام

قرآن مجید میں قیامت کے دن کا، اس کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے مختلف ناموں سے ذکر کیا گیا ہے۔

- جیسے وہ ایک عظیم اور کبیر دن ہوگا جس میں اول و آخر تمام انسان جمع ہوں گے، اس لیے سورۃ المطففین میں اسے يَوْمٍ عَظِيْمٍ [3] اور سورۂ ھود میں اسے يَوْمٍ كَبِيْرٍ [4] کہا گیا۔

---

[1] آل عمران 3:85 [2] یوسف 12:76 [3] المطففین 83:5 [4] ھود 11:3

- اس دن فیصلے ہوں گے، اس لیے سورۃ المرسلات میں اسے یَوْمُ الْفَصْلِ کہا گیا۔ ①
- اس دن تمام لوگ قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے، اس لیے سورۃ الروم میں اسے یَوْمُ الْبَعْثِ کہا گیا۔ ②
- اس دن تمام لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، اس لیے سورۃ التغابن میں اسے یَوْمِ الْجَمْعِ کہا گیا۔ ③
- اس دن لوگ میدان حشر میں کھڑے ہوں گے، اس لیے سورۃ النساء میں اسے یَوْمِ الْقِيٰمَةِ کہا گیا۔ ④
- اس دن سب لوگ حسرت کریں گے، نیک لوگ حسرت کریں گے کہ کاش انھوں نے اس سے زیادہ نیکیاں کیوں نہ کیں اور برے لوگ حسرت کریں گے کہ وہ دنیا میں برائی سے باز کیوں نہ رہے، اس لیے سورۂ مریم میں اسے يَوْمَ الْحَسْرَةِ کہا گیا۔ ⑤
- یہ ہار جیت کا دن ہوگا، اہل ایمان کو جیت اور اہل کفر کو ہار حاصل ہوگی، اس لیے سورۃ التغابن میں اسے یَوْمُ التَّغَابُنِ، یعنی ہار جیت کا دن کہا گیا۔ ⑥
- اس دن سب کو لازماً میدان حشر میں حاضر ہونا ہوگا، کوئی حاضری سے مستثنٰی ہوگا، نہ وہاں حاضری سے کسی کے لیے فرار ہونا ممکن ہوگا، اس لیے سورۂ ہود میں اسے يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ کہا گیا، یعنی ایسا دن جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔ ⑦
- یہ ایک معلوم، یعنی مقرر دن ہے، اس لیے سورۃ الواقعہ میں اسے يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ کہا گیا۔ ⑧
- یہ دن ہر صورت میں آنے والا ہے، اس لیے سورۂ مؤمن میں اسے يَوْمَ الْاٰزِفَةِ، یعنی قریب ہی آنے والا دن کہا گیا۔ ⑨
- یہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا دن ہے، اس لیے سورۃ المؤمن میں اسے يَوْمَ التَّلَاقِ، یعنی

---

① المرسلات 14:77 ② الروم 56:30 ③ التغابن 9:64 ④ النساء 87:4 ⑤ مریم 39:19
⑥ التغابن 9:64 ⑦ ہود 103:11 ⑧ الواقعۃ 50:56 ⑨ المؤمن 18:40

ملاقات کا دن کہا گیا۔ [1]

- اس دن جن وانس کا حساب ہوگا، اس لیے سورۂ صٓ میں اسے یَوْمِ الْحِسَابِ کہا گیا۔ [2]
- اس دن کا اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور اہل کفر سب سے وعدہ کیا ہے، اس اعتبار سے سورۃ البروج میں اسے یَوْمِ الْمَوْعُوْدِ کہا گیا، یعنی وہ دن جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ [3]
- کافروں کو اس دن کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اس لیے سورۂ قٓ میں اسے یَوْمُ الْوَعِیْدِ، یعنی ڈانٹ ڈپٹ کا دن کہا گیا۔ [4]
- یہ قبروں سے نکلنے کا دن ہے، اس لیے سورۂ قٓ میں اسے یَوْمُ الْخُرُوْجِ کہا گیا۔ [5]
- یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے، اس لیے سورۂ قٓ میں اسے یَوْمُ الْخُلُوْدِ کہا گیا۔ [6]
- یہ دنیا کی زندگی کے بعد آنے والا دن ہے، اس لیے اسے سورۂ بقرہ میں یَوْمِ الْاٰخِرِ کہا گیا۔ [7]
- اس دن جنتی جہنمیوں کو اور جہنمی جنتیوں کو پکاریں گے، اس لیے سورۃ المؤمن میں اسے یَوْمَ التَّنَادِ، یعنی ایک دوسرے کو پکارنے کا دن کہا گیا۔ [8]
- کافروں کے لیے یہ دردناک دن ہوگا، اس لیے سورۂ ہود میں اسے یَوْمٍ اَلِیْمٍ کہا گیا۔ [9]
- یہ کافروں کے لیے سخت مشکل دن ہوگا، اس لیے سورۂ مدثر میں اسے یَوْمٌ عَسِیْرٌ کہا گیا۔ [10]
- یہ دن کافروں کو گھیرنے والا ہوگا، اس لیے سورۂ ہود میں اسے یَوْمٍ مُّحِیْطٍ کہا گیا۔ [11]
- یہ دن نہایت سختیوں اور ہولناکیوں کی وجہ سے کافروں پر بڑا لمبا ہوگا، اس لیے سورۃ الدھر میں اسے یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا کہا گیا۔ [12]

روزِ قیامت کے احوال واوصاف

- اسی طرح بہت سے مقامات پر دوسرے انداز سے اس کی متعدد صفات بیان کی گئیں، جیسے

---

[1] المؤمن 15:40 [2] صٓ 53:38 [3] البروج 2:85 [4] قٓ 20:50 [5] قٓ 42:50 [6] قٓ 34:50
[7] البقرۃ 8:2 [8] المؤمن 32:40 [9] ہود 26:11 [10] المدثر 9:74 [11] ہود 84:11 [12] الدھر 10:76

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ﴾

''اے ہمارے رب! یقیناً تو لوگوں کو ایک دن جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔''[1]

- اور سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾

''اس دن کوئی لین دین ہو سکے گا، نہ کوئی دوستی اور سفارش ہی کام آئے گی۔''[2]

- اسی طرح سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴾

''اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی جان کو کچھ فائدہ نہیں دے گی اور نہ اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی۔''[3]

- اور سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ﴾

''اس دن ہر شخص اپنے کیے ہوئے اچھے عمل کو اور اپنے کیے ہوئے بُرے عمل کو اپنے سامنے پائے گا۔''[4]

- اسی طرح سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾

''اس دن کئی چہرے سفید ہوں گے اور کئی چہرے سیاہ ہوں گے۔''[5]

[1] آل عمران 3:9 [2] البقرة 2:254 [3] البقرة 2:48 [4] آل عمران 3:30 [5] آل عمران 3:106

- اورسورۃ الانعام اورسورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ﴾

''اس دن صور میں پھونکا جائے گا۔''[1]

- اورسورۃ التوبہ میں فرمایا:

﴿ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ﴾

''اس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔''[2]

- اورسورۃ المائدہ میں فرمایا:

﴿ يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ﴾

''اس دن سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی۔''[3]

- اسی طرح سورۂ ابراہیم میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾

''اس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی۔''[4]

- اورسورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ ﴾

''اس دن ہم تمام انسانوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔''[5]

- اورسورۃ الکہف میں فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ﴾

''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور آپ زمین کو صاف میدان دیکھیں گے۔''[6]

---

① الأنعام 6:73 و طٰہٰ 20:102 ② التوبة 9:35 ③ المائدة 5:119 ④ الإبراهيم 14:48

⑤ بنی اسراء یل 17:71 ⑥ الکہف 18:47

- اسی طرح سورۃ الفرقان میں فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ﴾

''اور اس دن ظالم اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹ کھائے گا۔'' [1]

- اور سورۃ الفرقان ہی میں فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ ﴾

''اور جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا۔'' [2]

- اور سورۃ الحج میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا ﴾

''اس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہوگی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی۔'' [3]

- اور سورۃ الشعراء میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾

''اس دن نہ مال کوئی نفع دے گا اور نہ بیٹے ہی۔'' [4]

- اسی طرح سورۃ المؤمن میں فرمایا:

﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ ﴾

''اس دن ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہ دے گی۔'' [5]

- اور سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ﴾

---

[1] الفرقان 27:25 [2] الفرقان 25:25 [3] الحج 2:22 [4] الشعراء 88:26 [5] المؤمن 52:40

''پس کیا حال ہوگا جب ہم انھیں اس دن جمع کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر شخص کو، جو اس نے کمایا ہوگا، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''[1]

◈ اسی طرح ایک اور انداز سے روز قیامت کی صفات بیان کی گئی ہیں، جیسے سورۃ التکویر میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ ○ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ○ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ○ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ○ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ○ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ○ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ○ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ○ وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ○ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ○ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ○ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ﴾

''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے، اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی، اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے، اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے، اور جب روحیں جسموں سے ملا دی جائیں گی، اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا، اسے کس گناہ کی وجہ سے قتل کیا گیا، اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے، اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی، اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی، اور جب جنت قریب لائی جائے گی۔''[2]

اسی طرح سورۃ الانفطار میں فرمایا:

﴿إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ ○ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ ○ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ﴾

''جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب تارے جھڑ جائیں گے، اور جب سمندر پھاڑ

---

[1] آل عمران 3:25 [2] التکویر 81:1، 13

دیے جائیں گے، اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی۔"[1]

اسی طرح سورۃ الانشقاق میں فرمایا:

﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾

"جب آسمان پھٹ جائے گا۔"

﴿ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴾

"اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔"[2]

ان آیات میں سورج اور دیگر آسمانی ستاروں کے بے نور ہونے، آسمان کے پھٹ جانے اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز کے ٹوٹ پھوٹ جانے کی اطلاع دی گئی ہے کہ جب یہ سب کچھ ہوگا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں جنت اور اہلِ جنت کا تذکرہ اور جہنم اور اہلِ جہنم کا بیان بڑی تفصیل سے جا بجا کیا گیا ہے۔ گویا قرآن مجید میں قیامت کے اوصاف و علامات اور احوال و واقعات اتنی تفصیل، تکرار اور متنوع انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ جس کے بعد اس کے انکار کی ادنیٰ سی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی۔

وقوع قیامت کے عقلی دلائل

لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ قرآن مجید تو اہل ایمان ہی پڑھتے ہیں، اس لیے وہی اس کی بیان کردہ حقیقتوں کو جان اور سمجھ سکتے ہیں اور انھی کا اس قرآن مجید پر یقین بھی ہے، چنانچہ اس کے بیان کردہ حالات و واقعات کو بھی وہی سچے اور حقیقتاً وقوع پذیر ہونے والے سمجھ سکتے ہیں۔ یوں آخرت کا یہ عقیدہ مسلمانوں کے نزدیک کتنا بھی اہم اور اس کا وقوع کتنا بھی یقینی ہو لیکن غیر مسلموں کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہے نہ اس کا وقوع یقینی۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ اگر انسان حسب ذیل چند پہلوؤں پر اپنی عنانِ توجہ مبذول کر لے اور انھیں اپنی فکر و نظر کا محور

[1] الإنفطار 82:1،4 [2] الإنشقاق 84:1-3

بنا لے تو عقلاً بھی قیامت کے وقوع اور اس کے حساب کتاب کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہے۔

① اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے اثرات اور نتائج رکھے ہیں اور ان کو اسباب کے ساتھ منسلک کر دیا ہے، جیسے آگ ہے، جب یہ جلائی جائے تو جو چیز اس کے سامنے آئے گی اس کو بھسم کر دے گی۔ اس کے برعکس پانی کی تاثیر ٹھنڈک پہنچانا ہے، یہ پانی آگ کے شعلوں پر ڈالا جائے گا تو یہ آگ کو بھی ٹھنڈا اور اس کی حرارت کو ٹھنڈک میں تبدیل کر دے گا۔ جب کسان زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج بو دیتا ہے تو اس کے نتیجے میں کچھ عرصے کے بعد زمین پھٹتی ہے اور اس سے کونپلیں اور انگوریاں نمودار ہوتی ہیں اور بتدریج وہ تن آور درخت یا کھیتیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر کسان جس چیز کے بیج بوتا ہے، اس سے اسی چیز کا پودا نمودار ہوتا ہے اور وہی پھل یا غلہ نکلتا ہے جو اس سے مطلوب اور اس کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ کبھی یہ نہیں ہوا کہ آم کی گٹھلی سے انگور یا انگور کی بیل سے آم، گندم کے بیج سے چاول یا چاول کے بیج سے گندم یا کسی اور قسم کے غلے کا درخت پھوٹ نکلا ہو۔ اسی طرح مکلّف مخلوق (جن اور انسان) کے اعمال کے اثرات اور نتائج ہیں۔ انسان جتنا کچھ اور جیسا کچھ عمل کرتا ہے، اس کا نتیجہ بھی اتنا ہی اور ویسا ہی نکلتا ہے، تھوڑے عمل کا تھوڑا اور زیادہ عمل کا زیادہ اور اچھے عمل کا اچھا اور برے عمل کا برا نتیجہ ظہور میں آتا ہے۔

② کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق مادیات و حسّیات سے ہے، ان کے نتائج بھی مادّی اور حسّی ہیں۔ اور کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق روحانیات یا مذہبی حقائق سے ہے، ان کے پورے نتائج کا اِس مادّی اور حسّی عالَم میں ظہور پذیر ہونا یقینی اور لازمی نہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اِس کے کچھ نتائج اس دنیا میں بھی دکھا دے لیکن ان کے پورے نتائج کے لیے اس نے ایک اور دن مقرر کیا ہوا ہے جہاں ہر عملِ روحانی کا مکمل نتیجہ سامنے آئے گا اور یہ وہی دن ہے جس کو یوم آخرت، یوم معلوم اور یوم موعود کہا گیا ہے اور جس کی کچھ صفات

گزشتہ صفحات میں گزریں۔

مادّی و حسّی اعمال اور اس کے نتائج و اثرات، آج کل ہمیں مغربی اقوام میں زیادہ نظر آتے ہیں، وہ دنیا کے لیے محنت، جدوجہد اور مسلسل عمل کرتے ہیں، اس کے لیے وہ اپنے قانون اور ضابطے کی پابندی کرتے ہیں، امانت و دیانت کو اپناتے ہیں اور قول و عمل میں ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ مادّی ترقی کی دوڑ میں بہت آگے ہیں، تجارت و کاروبار میں کامیاب ہیں، پوری دنیا میں ان کی تجارتی ساکھ قائم ہے اور دنیوی آسائشوں اور سہولتوں کی ان کے ہاں فراوانی ہے۔ لیکن جن اعمال کا تعلق روحانیات یا مذہبیات سے ہے یا جن کو عمل صالح اور حسنہ یا عمل سوء اور سیئہ کہا جاتا ہے، یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے اچھے عمل قرار دیا اور ان کو اختیار کرنے کی ترغیب یا حکم دیا اور جن کو برے عمل کہا اور ان سے بچنے کی تلقین اور ان کی ممانعت فرمائی، ان اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کے اعتبار سے یہ قومیں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مختلف نظریہ رکھتی ہیں، اس لیے ان میں مذہب کے حوالے سے بہت خطرناک پہلو ہیں اور اعمالِ سیئہ اور فاحشہ کا ارتکاب ان میں عام ہے۔ لیکن ان کے نتائج ضروری نہیں کہ اس مادّی اور حسّی عالم میں ظاہر ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہیں، وہ دنیا میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ انھیں پاداش عمل میں عذاب سے دوچار کر دے۔ لیکن پھر بھی وہ مکمل نتائج نہیں ہوں گے، ان کا کچھ حصہ ہی ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لَنُذِیۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰی دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴾

”ہم انھیں بڑے عذاب سے پہلے ادنیٰ عذاب چکھائیں گے، شاید کہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں۔“[1]

---

[1] السجدة 21:32

برے اعمال کے برے نتائج کے مکمل ظہور کے لیے آخرت ہی کا دن ہے۔

③ برے عمل کی سزا کا اصل مقام، آخرت ہی ہے کیونکہ دنیا تو دارالعمل اور دارالامتحان ہے، یہاں تو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو عمل اور ارادے کی آزادی دی ہے، یہ آزادی دے کر وہ آزمانا چاہتا ہے کہ وہ زندگی کس طرح گزارتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے ضابطوں اور ہدایات کے مطابق یا ان سے اعراض اور انکار کرکے؟ اگر وہ کچھ سزا دیتا بھی ہے تو اس کا مقصد صرف تنبیہ اور ڈرانا ہے تاکہ غفلت ونسیان کے پردے چاک ہو جائیں اور انسان اصل مقصدِ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ یہ چھوٹے موٹے عذاب، ابتلائیں اور آزمائشیں مکمل سزا نہیں، مکمل سزا آخرت ہی میں ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے افراد معصیتوں میں غرق ہوتے ہیں، شب وروز اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کا ارتکاب ان کا وتیرہ اور حدودِ الٰہی کو توڑنا ان کا شیوہ ہوتا ہے، اور یوں ہی ان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے اور بظاہر وہ کسی گرفت یا عذاب سے دوچار نہیں ہوتے۔ بہت سے افراد ہوتے ہیں، انھوں نے دسیوں، بیسیوں ناحق خون بہائے ہوتے ہیں، وہ اگر قانون کے شکنجے میں آتے بھی ہیں اور تختۂ دار پر لٹکا بھی دیے جاتے ہیں، تب بھی انھیں ایک ہی خون ناحق کی سزا ملتی ہے جبکہ وہ دسیوں یا بیسیوں افراد کے قاتل ہوتے ہیں۔ لیکن انسان اس بات پر قادر ہی نہیں ہے کہ وہ ایسے مجرم کو مکمل سزا دے سکے، وہ ایک قتل کے جرم میں قاتل کو ایک مرتبہ سزائے موت دے گا جبکہ اس کی گردن پر ابھی کئی مقتولوں کا خون باقی ہوتا ہے لیکن انسان اسے دوبارہ سزائے موت دینے پر قادر ہی نہیں ہے، اس کو مکمل سزا آخرت کے دن ہی ملے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے، وہ اس کو اس کے جرموں کے مطابق مکمل سزا دے گا۔

اسی طرح یہ بات بھی عام تجربے اور مشاہدے کا حصہ ہے کہ بعض لوگ نہایت متقی اور

اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہوتے ہیں، ان کی زندگی پاکیزگی اور تقویٰ پر مبنی ہوتی ہے لیکن ان کی دنیوی زندگی نہایت عسرت و تنگ دستی یا مسلسل ابتلاء و آزمائش میں گزرتی ہے، انھیں دنیا میں عموماً سکھ اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ ایسے پاک باز لوگوں کو بھی ان کی نیکیوں اور آزمائشوں کا صلہ آخرت ہی میں ملے گا کیونکہ دنیا میں تو ان کو کچھ نہیں ملا حتی کہ ان کی ساری زندگی ہی دکھوں میں گزر گئی، جبکہ اس کے برعکس ان کے سامنے گناہ گار اور نافرمان عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہے۔ اب اگر قیامت کا وہ دن نہ ہو جس میں ہر شخص کو اس کے اچھے یا برے عمل کے مطابق جزا اور سزا ملے تو یہ صریح ظلم ہوگا۔ نیک لوگ اپنی نیکیوں کے صلے سے محروم رہیں گے اور بُرے لوگ اپنی برائیوں کی سزا سے محفوظ رہیں گے۔ کیا اللہ تعالیٰ سے اس ظلم کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نیک و بد دونوں کو برابر کر دے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو روز جزا کا وقوع اور اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل و انصاف کا اہتمام ہی ہے۔ اس عدل و انصاف کے لیے ایک روز جزا کا وقوع نہایت ضروری ہے۔ اسی بات کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيٓءُ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ ○ إِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾

''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اور برائی کرنے والا برابر نہیں، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ بلاشبہ قیامت یقیناً آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔'' [1]

اللہ تعالیٰ نے اندھے اور بینا آدمی کی مثال دے کر نیکوکار اور بدکار کا ذکر فرمایا کہ یہ دونوں

---

[1] المؤمن 40:58-59

برابر نہیں ہو سکتے اور اس کے ساتھ ہی قیامت کے وقوع کا ذکر فرمایا جس کا مطلب یہی ہے کہ وہاں ان دونوں کے ساتھ ایک جیسا معاملہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ دونوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا ایسا ہی ہے جیسے اندھے اور بینا شخص کو برابر قرار دے دیا جائے۔ کیا کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں، اس دن نیک اور بد دونوں ایک جیسے نہیں ہوں گے بلکہ نیک لوگ رحمت اور مغفرت الٰہی کے مستحق اور بد لوگ تعزیر اور عتاب کے سزاوار ٹھہریں گے۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾

''کیا جن لوگوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انھیں ان لوگوں کے مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کا جینا اور مرنا برابر ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''[1]

یعنی یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم دونوں کو برابر کر دیں، جیسا کہ نافرمانوں کی خواہش اور ان کا خیال ہے، اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب ہوگا کہ دونوں کا مرنا جینا برابر ہے اور مرنے کے بعد دونوں کا وجود ناپید ہو گیا ہے، نہ برے کو اس کی برائی کی سزا ملی، نہ نیک آدمی کو اس کی نیکیوں کا صلہ ملا۔ اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوگا؟

④ علاوہ ازیں دنیا میں حق و باطل کی کشمکش اور خیر و شر کے درمیان معرکہ آرائی ہمیشہ اور ہر دور میں رہی ہے اور تا قیامت رہے گی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی حق غالب اور باطل مغلوب ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ کسی وجہ سے عارضی طور پر اس کے برعکس، حق مغلوب اور باطل غالب اور فتح یاب ہو جاتا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، یہ صورت حال قائم رہتی

[1] الجاثیة 21:45

ہے۔حق و باطل کی اس کشمکش میں بہت سے اہل حق اپنی جان و مال کی بیش بہا قربانیاں پیش کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کو اس کا کوئی صلہ نہیں ملتا۔ اگر ان کے اجر وثواب اور حسن صلہ کے لیے کوئی دن نہ ہوتو حق و باطل کی یہ معرکہ آرائی محض ایک کھیل قرار پائے گا، اور کوئی شخص بھی حق کے غلبے اور باطل کی سرکوبی کے لیے جان و مال کی قربانی پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

مذکورہ نکتے عقلی طور پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایک دن ضرور ایسا ہونا چاہیے، جب ہر قسم کی ناانصافیوں کا ازالہ ہواور ہر شخص کو اس کی کمائی کے مطابق اچھی یا بری جزا ملے۔ یہی وہ روز جزا ہے جس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ مالک تو ہر چیز کا آج بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن چونکہ دنیا میں عارضی طور پر اور بھی کئی لوگوں کے پاس ماتحت الاسباب اختیارات ہوتے ہیں مگر آخرت میں تمام اختیارات کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس روز فرمائے گا:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾

’’آج کس کی بادشاہی ہے؟‘‘

پھر وہی جواب دے گا:

﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾

’’صرف ایک غالب اللہ کی۔‘‘[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾

’’اس دن کوئی ہستی کسی کے لیے کوئی اختیار نہیں رکھے گی، سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ

---

[1] المؤمن 40:16

میں ہوگا۔''[1]

یہ ہوگا جزا کا دن جس کو قیامت کہتے ہیں اور عقل ونقل کے اعتبار سے جس کا وقوع یقینی ہے اوراس پر یقین رکھنا ایمان کا حصہ ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان ہوئیں۔ صفت ربوبیت، صفت رحمت اور صفت عدالت۔ گویا جو ذات مذکورہ صفات کی حامل ہے، وہی ذات اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، نہ کہ کسی اور کی یا کسی اور کی بھی۔ اور مدد بھی صرف اسی سے مانگی جائے، نہ کہ کسی اور سے یا کسی اور سے بھی۔

عبادت اور استعانت کا معنی ومفہوم

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں عبادت کے معنی یوں کرتے ہیں: أَقْصٰى غَايَاتِ الْخُضُوعِ وَ التَّذَلُّلِ ''انتہائی تذلّل وعاجزی اور کمالِ خشوع کا اظہار، عبادت ہے۔''

اور پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ''شریعت میں کمالِ محبت، خضوع اور خوف کے مجموعے کا نام عبادت ہے۔''[2]

یعنی جس ذات کے ساتھ محبت بھی ہو، اس کی مافوق الاسباب طاقت کے سامنے عاجزی اور بے بسی کا اظہار بھی ہو اور اسباب و مافوق الاسباب ذرائع سے اس کی گرفت کا خوف بھی۔ اور جس ذات کی دل میں انتہائی محبت بھی ہو اور اس کی عظمت وجلالت کی ہیبت بھی تو انسان اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ یوں عبادت میں اطاعت کا مفہوم

---

[1] الإنفطار 19:82 [2] تفسیر فتح القدیر، الفاتحۃ:5/1

بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے عبادت کے ساتھ، اطاعت بھی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف عبادات ہی میں اللہ تعالیٰ کا حق تسلیم نہ کرے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی حاکمیت اور بالا دستی کو تسلیم کرے اور اس کی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرنے کو ضروری سمجھے۔ گویا معبود بھی صرف اور صرف ایک اللہ ہے اور مطاع مطلق بھی صرف وہی ایک اللہ۔ نہ تعظیم وخوف سے کسی کے آگے ماتھا ٹیکنے کی اجازت ہے اور نہ ہدایت و رہنمائی کے لیے کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت۔ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کے ساتھ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [1] کے تقاضے بھی پورے کرنے ضروری ہیں۔ ایک اسلامی مملکت میں غیر اللہ کی عبادت کی جس طرح گنجائش نہیں ہوتی، اسی طرح اس کی حاکمیت سے منہ موڑنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر عبادت کا لفظ اطاعت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

جیسے سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ ''تم اپنے رب کی عبادت کرو۔'' [2]

اور سورۂ یٰسٓ میں ہے:

﴿لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾ ''تم شیطان کی عبادت نہ کرو۔'' [3]

اور اس سے اگلی آیت میں ہے:

﴿وَاَنِ اعْبُدُوْنِيْ﴾ ''اور صرف میری عبادت کرو۔'' [4]

اسی طرح سورۃ الذاریات میں ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔'' [5]

ان تمام مقامات پر عبادت، اطاعت کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ عبادت کے علاوہ

---

[1] یوسف 40:12 [2] البقرۃ 21:2 [3] یٰسٓ 60:36 [4] یٰسٓ 61:36 [5] الذّٰریٰت 56:51

بھی بے شمار کام ہیں اوران تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی تب ہی عبادت شمار ہوگی، جب وہ اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہوگی۔ گویا عبادت میں بھی جب تک اطاعتِ الٰہی کا عنصر شامل نہیں ہوگا، عبادت بھی نامقبول ہوگی۔ جیسے کوئی شخص اپنے من مانے طریقے سے نماز پڑھے یا زکاۃ ادا کرے یا حج اور قربانی کرے وغیرہ، ان کی ظاہری شکل بے شک نماز کی، زکاۃ کی یا حج اور قربانی وغیرہ کی ہو لیکن عنداللہ وہ نماز ہوگی، نہ زکاۃ، حج ہوگا اور نہ قربانی۔ اور یہ تو واضح ہی ہے کہ رسول کی اطاعت بھی صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾

”ہم نے ہر رسول اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“[1]

بلکہ رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت قرار دیا۔ جیسے فرمایا:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾

”جس نے رسول کی اطاعت کی، پس تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“[2]

اس لیے رسول کی اطاعت تو ضروری اور لازمی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہے اور وہی اللہ کی عبادت و اطاعت کا طریقہ بھی بتلاتا ہے، تاہم رسول کے علاوہ کسی کی اطاعت ضروری نہیں۔ اطاعت کا مستحق صرف اللہ اوراس کا رسول ہے، باقی سب ان کے ماتحت ہیں اوران کی اطاعت اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہوگی۔

سیدھی عبارت نَعْبُدُكَ وَ نَسْتَعِيْنُكَ ہوتی، یعنی ہم تیری عبادت کرتے اور تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں مفعول کو فعل پر مقدم کر کے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ

---

[1] النساء 4:64 [2] النساء 4:80

نَسْتَعِيْنُ﴾ فرمایا جس سے مقصد اختصاص پیدا کرنا ہے، یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس اختصاص سے شرک کا سد باب کردیا گیا ہے، یعنی عبادت کی ہر قسم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص اور صرف اسی کا حق ہے، عبادت چاہے قولی ہو یا بدنی یا مالی۔قولی عبادت، جیسے دعا کرنا، استغفار کرنا وغیرہ۔ بدنی عبادت، جیسے نماز اور اس کے ارکان، رکوع، سجود، دست بستہ قیام وغیرہ۔ علاوہ ازیں روزہ، طواف وغیرہ۔ مالی عبادت، جیسے صدقہ اور نذرانہ وغیرہ۔ اسی طرح وہ عبادات جن پر مالی اور بدنی دونوں قسموں کا اطلاق ہوسکتا ہے، جیسے حج ہے۔ یہ تمام کام عبادت ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس لیے مذکورہ عبادات میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا جائز نہیں ہے۔ نہ کسی سے طلبِ حاجات یا دفعِ مشکلات کے لیے دعا کی جاسکتی ہے، نہ بخشش اور معافی کی التجا کی جاسکتی ہے، نہ کسی کے لیے نماز پڑھی جاسکتی ہے، نہ اس کے ارکان میں سے کسی رکن ہی کو ادا کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بیت اللہ کے سوا کسی اور جگہ کا طواف کیا جا سکتا ہے، نہ اللہ کے سوا کسی کے نام کی نذرو نیاز دی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی ان میں سے کوئی کام بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے کرے گا تو یہ شرک کا ارتکاب ہوگا جو ناقابل معافی ہے، یعنی شرک کے مرتکب نے اگر دنیا ہی میں توبہ کر کے توحید کو نہ اپنایا اور مشرکانہ عقیدہ وعمل کے ساتھ ہی فوت ہوگیا تو ہمیشہ جہنم میں رہنا اس کا مقدر ہوگا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

''اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کے چاہے گا، معاف فرمادے گا۔''[1]

بدقسمتی سے جن لوگوں کے دلوں میں شرک کا روگ راہ پا گیا ہے، وہ مافوق الاسباب اور

---

[1] النساء 4:48

ماتحت الاسباب استعانت میں فرق کو نظر انداز کر کے عوام کو مغالطے میں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہم بیمار ہو جاتے ہیں تو ڈاکٹر سے مدد حاصل کرتے ہیں، بیوی سے مدد چاہتے ہیں، ڈرائیور اور دیگر انسانوں سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ یہ باور کراتے ہیں کہ اللہ کے سوا اوروں سے بھی مدد مانگنا جائز ہے، گویا دعا میں، جو عبادت ہی کی ایک قسم ہے، غیر اللہ کو شریک کرنا جائز ہے۔ اور پھر وہ ان غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز بھی دیتے ہیں، یوں مالی عبادت میں بھی ان کو شریک ٹھہرا لیتے ہیں۔ حالانکہ اسباب کے ماتحت ایک دوسرے سے مدد چاہنا اور مدد کرنا، یہ شرک نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جس میں سارے کام ظاہری اسباب ہی کے مطابق ہوتے ہیں حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام بھی انسانوں کی مدد حاصل کرتے تھے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾

”اللہ کے دین کے لیے کون میرا مددگار ہے۔“[1]

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں آپ عرب کے مختلف قبائل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ان سے یہ بھی فرماتے کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے، تم مجھے اس وقت تک تحفظ دو جب تک میں اللہ کا پیغام لوگوں تک نہ پہنچا دوں کیونکہ مجھے اللہ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو فرمایا:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى﴾

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔“[3]

ظاہر بات ہے کہ یہ تعاون ممنوع ہے نہ شرک ہی بلکہ مطلوب و پسندیدہ ہے۔ اس کا اصطلاحی شرک سے کیا تعلق؟ شرک تو یہ ہے کہ ایسے شخص سے مدد طلب کی جائے جو ظاہری اسباب کے

---

① آل عمران 3:52 و الصف 61:14 ② البداية والنهاية:3/38 (طبع جديد) ③ المائدة 5:2

لحاظ سے مدد نہ کرسکتا ہو، جیسے کسی فوت شدہ شخص کو مدد کے لیے پکارنا، اس کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا، اس کو نافع (نفع دینے والا) اور ضار (نقصان پہنچانے والا) باور کرنا اور دور ونزدیک سے ہر ایک کی فریاد سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور تسلیم کرنا۔ اس کا نام ہے مافوق الاسباب طریقے سے مدد طلب کرنا اور اسے اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف ماننا، اسی کا نام شرک ہے جو بدقسمتی سے ''محبت اولیاء'' کے نام پر مسلمان ملکوں میں عام ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ۔

آدابِ دعا

قرآن کریم کے اس انداز سے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہوئیں اور پھر اس سے مدد مانگی جارہی ہے، یہ معلوم ہوا کہ دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی جائے اور حدیث میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پھر نبی ﷺ پر درود بھی پڑھا جائے۔ جیسے سنن ابی داود، جامع ترمذی اور سنن نسائی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دعا مانگتے ہوئے سنا، اس نے اللہ کی حمد کی نہ نبی ﷺ پر درود پڑھا تو آپ نے فرمایا: عَجِلَ هٰذَا ''اس نے جلد بازی کی۔'' پھر آپ ﷺ نے اسے بلایا اور اس سے یا کسی اور سے فرمایا:

«إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَمْجِيدِ رَبِّهِ وَ الثَّنَاءِ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ يَدْعُو بَعْدُ بِمَا شَاءَ»

''جب تمھارا ایک آدمی نماز پڑھ چکے (اور اس کے بعد دعا مانگنے لگے) تو اسے چاہیے کہ پہلے اللہ کی حمد وثنا بیان کرے، پھر نبی ﷺ پر درود پڑھے، پھر اس کے بعد جو چاہے دعا کرے۔''[1]

---

[1] سنن أبي داود، الوتر، باب الدعاء، حديث: 1481 و جامع الترمذي، الدعوات، باب في إيجاب الدعاء......، حديث: 3477 و سنن النسائي، السهو، باب التمجيد والصلاة على النبي ﷺ في الصلاة، حديث: 1285

جامع ترمذی کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی ﷺ تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد دعا مانگی: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ ''اے اللہ! مجھے معاف کردے اور مجھ پر رحم فرما۔'' آپ نے فرمایا:

«عَجِلْتَ أَيُّهَا الْمُصَلِّي إِذَا صَلَّيْتَ فَقَعَدْتَّ فَاحْمَدِ اللهَ بِمَا هُوَ أَهْلُهُ

''اے نمازی! تو نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ جب تو نماز پڑھ کر بیٹھے (اور دعا کرے) تو اللہ کی اس طرح حمد کر جیسا کہ وہ اس کا مستحق ہے اور مجھ پر درود پڑھ، پھر اللہ سے دعا کر۔''

اس کے بعد ایک اور آدمی آیا، اس نے بھی نماز پڑھی (اور اس کے بعد) اللہ کی حمد کی اور نبی ﷺ پر درود پڑھا (لیکن اس نے دعا نہیں مانگی)، آپ نے اس سے فرمایا:

«أَيُّهَا الْمُصَلِّي ادْعُ تُجَبْ»

''اے نمازی! دعا کر، تیری دعا قبول کی جائے گی۔''[1]

علاوہ ازیں آدابِ دعا میں یہ بھی شامل ہے کہ حضورِ قلب سے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا کرے۔ دل میں غفلت ہو، نہ توجہ کسی اور طرف ہو، قبولیت کا یقین اور اعتماد ہو اور حرام کھانے سے اجتناب ہو وغیرہ۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

دکھا ہم کو راستہ سیدھا

ہدایت کا مفہوم

(ھدایت) کا لفظ قرآن کریم میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

[1] جامع الترمذي، الدعوات، باب في إيجاب الدعاء......، حديث: 3476

① راستے کی طرف رہنمائی کرنا، راستہ بتلا دینا۔ اسے ارشاد اور دلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

② صحیح راستے پر چلا دینا، راہِ حق پر چلنے کی توفیق سے نواز دینا۔ اسے توفیق اور الہام کہا جاتا ہے۔

پہلے معنی کے اعتبار ہی سے علماء، داعیانِ حق اور انبیاء علیہم السلام کو ہادی کہا جاتا ہے، یعنی وہ خیر اور بھلائی کے راستوں کی نشاندہی اور ان کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہادی ہے، یعنی وہی حق کو قبول کرنے کی توفیق سے نواز کر صحیح راستے پر چلاتا ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

''اے پیغمبر! آپ رہنمائی کرتے ہیں سیدھے راستے کی طرف۔''[1]

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

''آپ اس کو ہدایت نہیں دے سکتے جسے پسند کریں، لیکن اللہ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''[2]

پہلی آیت میں ہدایت بمعنی رہنمائی ہے، اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبی فریضہ بتلایا گیا ہے۔ اور دوسری آیت میں ہدایت بمعنی صحیح راستے پر چلا دینا اور قبولِ حق کی توفیق سے نواز دینا ہے۔ اس ہدایت کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا اثبات کیا گیا ہے۔

یہاں سورۂ فاتحہ میں ہدایت دوسرے مفہوم میں ہے، یعنی ایک مومن جسے سیدھے راستے کی رہنمائی تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور نبوت کے وارثین علماء و دعاۃ کی طرف سے مل چکی ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق مانگ رہا ہے۔ اسی لیے ﴿اِهْدِنَا﴾ کے

---

① الشوریٰ 52:42 ② القصص 56:28

معنی کیے گئے ہیں:

«أَلْهِمْنَا، وَفِّقْنَا، اُرْزُقْنَا یا أَعْطِنَا»

’’ہمیں ہدایت الہام فرمادے، یا ہمیں اس کی توفیق دے دے، یا ہدایت دے دے یا عطا کردے۔‘‘[1]

علاوہ ازیں ایک مومن ہر لمحے اور ہر آن اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج اور قدم قدم پر اس کی دست گیری کا ضرورت مند ہے، اس لیے وہ جب دسیوں اور بیسیوں مرتبہ نماز میں اللہ تعالیٰ سے سیدھے راستے کی دعا مانگتا ہے تو اس کا مطلب استمرار اور دوام طلب کرنا ہے۔ یعنی اے اللہ! تو نے ہمیں ہدایت پر چلایا ہے تو اس پر ثابت قدم بھی رکھ اور زندگی کے ہر موڑ پر صحیح راستے کی طرف نہ صرف رہنمائی فرما بلکہ اس پر ہمیں چلاتا بھی رہ، اور کسی بھی مرحلے اور مقام پر ہمارے قدم سیدھے راستے سے نہ ڈگمگائیں۔

صراط مستقیم سے مراد

﴿ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ ’’سیدھا راستہ‘‘ کیا ہے؟ کسی نے اسے اسلام سے، کسی نے کتاب اللہ سے، کسی نے اتباع رسول سے تعبیر کیا ہے، ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے، یعنی وہ سیدھا اور واضح راستہ جس میں کوئی کجی اور ٹیڑھ پن نہیں، جسے کتاب اللہ میں بیان کیا گیا ہے اور اسی کو اسلام کہا جاتا ہے اور دین اسلام کو اختیار کرنا ہی رسول اللہ ﷺ کا اتباع بھی ہے کیونکہ آپ ہی پر یہ قرآن کریم نازل ہوا اور آپ ہی پر دین اسلام کی تکمیل ہوئی۔ اسی لیے مسند احمد کی ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا، وَّ عَلٰى جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُورَانِ،

---

[1] تفسیر ابن کثیر، الفاتحۃ:6/1

فِيهِمَا أَبْوَابٌ مُّفَتَّحَةٌ، وَعَلَى الْأَبْوَابِ سُتُورٌ مُّرْخَاةٌ، وَعَلٰى بَابِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَّقُولُ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ، ادْخُلُوا الصِّرَاطَ جَمِيعًا، وَّ لَا تَتَعَرَّجُوا، وَدَاعٍ يَّدْعُوا مِنْ فَوْقِ الصِّرَاطِ، فَإِذَا أَرَادَ يَفْتَحُ شَيْئًا مِّنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ، قَالَ: وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ، فَإِنَّكَ إِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ، وَالصِّرَاطُ: الْإِسْلَامُ، وَالسُّورَانِ: حُدُودُ اللهِ، وَالْأَبْوَابُ الْمُفَتَّحَةُ: مَحَارِمُ اللهِ، وَذٰلِكَ الدَّاعِي عَلٰى رَأْسِ الصِّرَاطِ: كِتَابُ اللهِ، وَالدَّاعِي مِنْ فَوْقِ الصِّرَاطِ: وَاعِظُ اللهِ فِي قَلْبِ كُلِّ مُسْلِمٍ»

’’اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم (سیدھے راستے) کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اور اس الصراط (راستے) کے دونوں جانب دو فصیلیں ہیں جن میں کھلے ہوئے کئی دروازے ہیں۔ اور دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں اور راستے کے دروازے پر ایک داعی ہے جو کہہ رہا ہے: اے لوگو! سب کے سب اس سیدھے راستے میں داخل ہو جاؤ اور کجی اختیار نہ کرو۔ اسی طرح ایک اور داعی ہے جو راستے کے اوپر سے لوگوں کو بلا رہا ہے۔ جب انسان ارادہ کرتا ہے کہ وہ ان دروازوں میں سے کسی کو کھولے (اللہ کی حرام کردہ کسی چیز کا ارتکاب کرے) تو وہ کہتا ہے: تیرے لیے خرابی ہو، اسے نہ کھول، اس لیے کہ اگر تو اس کو کھول دے گا تو اس میں داخل ہو جائے گا۔ پس الصراط (راستے سے مراد) اسلام ہے، اور دو فصیلیں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ کے محارم (حرام کردہ چیزیں) ہیں، اور وہ داعی جو راستے کے سرے پر ہے، اللہ کی کتاب ہے اور راستے کے اوپر سے بلانے والا (داعی) اللہ کی طرف سے واعظ ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہے۔‘‘ [1]

[1] مسند أحمد:4/182-183 والمستدرك للحاكم:1/73 و جامع الترمذي، الأدب، باب ما جاء في مثل الله عزو جل لعباده، حديث:2859 و صحيح الجامع، حديث:3887

اس حدیث میں ایک تو اسلام ہی کو سیدھا راستہ قرار دیا گیا ہے اور دوسرے سب کو اسی راستے پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے کجی اختیار کر کے اِدھر اُدھر کے دوسرے راستوں پر جانے سے روکا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس کی مزید وضاحت نبیٔ اکرم ﷺ نے اس طرح فرمائی کہ پہلے آپ نے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا: «هٰذَا سَبِيلُ اللهِ»

''یہ اللہ کا راستہ ہے۔''

پھر آپ نے اس کے دائیں اور بائیں چند خطوط کھینچے اور فرمایا:

«هٰذِهِ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ يَّدْعُو إِلَيْهِ»

''یہ مختلف راستے ہیں، ان میں سے ہر ایک راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہوا ہے جو اس راستے کی طرف بلاتا ہے۔''

پھر آپ نے سورۃ الانعام کی آیت (153) تلاوت فرمائی:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾

''یہ ہے میرا راستہ سیدھا، پس تم اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھیں اس سیدھے راستے سے ہٹا دیں گے۔''[1]

ان احادیث اور آیتِ کریمہ سے واضح ہوا کہ اسلام کا راستہ، اللہ کا راستہ اور نبی ﷺ کا راستہ ایک ہی ہے، متعدد نہیں۔ اور وہی راستہ سیدھا ہے جس کے اختیار کرنے ہی پر نجاتِ اخروی کی اور رضائے الٰہی کے حصول کی امید ہے۔

بلکہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں مزید صراحت ہے کہ ایک سیدھا خط کھینچ کر نبی ﷺ نے

---

[1] مسند أحمد: 1/435-465 والمستدرك للحاكم: 2/318

اس کے دائیں جانب دو خط اور بائیں جانب بھی دو خط کھینچے۔ پھر درمیانی خط پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ بہر حال حق کا راستہ ایک ہی ہے، چار یا پانچ نہیں کیونکہ حق ایک ہی ہوسکتا ہے متعدد نہیں۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ﴾

''حق کے بعد جو کچھ ہے، وہ گمراہی ہے۔''[1]

اس راہِ حق یا صراطِ مستقیم کی علامت بھی رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادی تاکہ مختلف راستوں میں سے حق کے راستے کی پہچان کی جا سکے اور وہ علامت ہے، رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے راستے پر چلنے والی جماعت کا راستہ جسے زبان رسالت نے «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي» کے الفاظ میں ادا فرمایا۔[2]

یعنی تمام فرقوں میں صرف وہ جماعت نجات پائے گی جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقے پر چلنے والی ہوگی۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا

یہ ﴿صِرَاطَ﴾ ، ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ سے بدل ہے، یعنی وہ سیدھا راستہ، جس پر چلنے کی اور استقامت کی دعا ہم مانگ رہے ہیں، ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تیرا انعام و احسان ہوا۔ اور اس احسان کی وجہ سے ایک تو وہ نعمتِ ایمان سے سرفراز ہوئے، یعنی اللہ تعالیٰ پر اور ان تمام چیزوں پر جن پر ایمان لانا واجب تھا، وہ ایمان لائے۔ دوسری نعمت ان کو یہ حاصل ہوئی کہ انھیں اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء و صفات کی صحیح معرفت حاصل ہوئی۔ تیسری نعمت، اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا علم ہے جو انھیں حاصل ہوا اور چوتھی نعمت

[1] يونس 32:10 [2] جامع الترمذي، الإيمان، باب ما جاء في افتراق هذه الأمة، حديث:2641 و صحيح الجامع، حديث:5343

وہ توفیق الٰہی ہے جس کی وجہ سے انھوں نے پسندیدہ باتوں کو اختیار اور ناپسندیدہ باتوں سے اجتناب کیا۔ یہ انعام یافتہ لوگ کون سے یا کون کون سے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی وضاحت فرما دی:

﴿ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾

"جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں، وہ قیامت کے روز ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ۔ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔"[1]

اس آیت میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ انعام یافتہ لوگوں کا یہ راستہ اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول ہی کا راستہ ہے، نہ کہ کوئی اور راستہ۔ علاوہ ازیں یہ راستہ محض عقل اور ذہانت سے حاصل نہیں ہوسکتا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے احسان ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس میں وہ صحیح راستے کی سچی طلب اور خالص نیت پاتا ہے، اسے انعام و اکرام سے نواز کر وہ انبیاء اور صدیقین کے اس راستے پر چلا دیتا ہے جس کا نام الاسلام ہے اور جو قرآن اور احادیث صحیحہ میں محفوظ ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ

نہ راستہ ان لوگوں کا کہ غضب نازل ہوا ان پر اور نہ گمراہوں کا

یہ جملہ ما قبل کی صفت ہے اور مضاف الیہ محذوف ہے، یعنی غَيْرَ صِرَاطِ الَّذِيْنَ، جیسا کہ ترجمے میں اس محذوف کو کھول دیا گیا ہے، اور ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ میں لا تاکید نفی کے لیے ہے۔

---

[1] النساء 4:69

مغضوب علیہم اور ضالین سے مراد کون ہیں؟

اس ٹکڑے میں دعا کی گئی ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر نہ چلانا جن پر غضب ہوا یا جو گمراہ ہیں۔ مغضوب علیہ قومیں اور افراد بھی بہت سے گزرے ہیں اور اسی طرح گمراہ بھی۔ ان سب ہی سے بچنے کی دعا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں بطور خاص یہود پر غضبِ الٰہی کے مستحق بننے کو اور عیسائیوں کی گمراہی کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس آیت میں مغضوب علیھم (جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا) سے یہود اور ضالّین (گمراہوں) سے عیسائی مراد ہیں۔

تفسیر فتح القدیر میں ہے، ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

«لَا أَعْلَمُ خِلَافًا بَيْنَ الْمُفَسِّرِينَ فِي تَفْسِيرِ ﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ بِالْيَهُودِ وَ﴿الضَّالِّينَ﴾ بِالنَّصَارٰى»

مفسرین کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ﴿الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود اور ﴿الضَّالِّينَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں۔[1]

اور یہی تفسیر صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ بَلقَین کے ایک آدمی نے وادیٔ القریٰ میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ المغضوب علیھم ہیں۔ اور یہود کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پھر سوال کیا: یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے جواب دیا: یہ الضالون، یعنی نصاریٰ ہیں۔[2]

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ المغضوب علیھم، یہود اور الضالون، نصاریٰ ہیں۔ اسی طرح کی ایک روایت جامع ترمذی میں ہے، سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلْيَهُودُ مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ وَالنَّصَارٰى ضُلَّالٌ»

[1] تفسير فتح القدير، الفاتحة: 7/1 و تفسير ابن كثير، الفاتحة: 7/1 [2] مسند أحمد: 5/32-33-77

''یہودیوں پر غضب نازل کیا گیا اور نصاریٰ گمراہ ہیں۔''[1]

اس لیے صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ دونوں کی گمراہیوں سے بچ کر رہیں۔ یہود کی بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ جانتے بوجھتے صحیح راستے پر نہیں چلتے تھے، آیاتِ الٰہی میں تحریف اور حیلہ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ سیدنا عزیر علیہ السلام کو انھوں نے اِبْنُ اللّٰہِ (اللہ کا بیٹا) کہا اور اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام قرار دینے کا مجاز سمجھا۔ اور نصاریٰ کی بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں غلو کیا اور انھیں ثَالِثُ ثَلاَثَۃٍ (اللہ کا بیٹا اور تین معبودوں میں سے ایک معبود) قرار دیا۔ افسوس ہے کہ امت محمدیہ میں بھی جہاں یہودیوں کی مذکورہ خرابیاں عام ہیں، وہاں وہ عیسائیوں والی گمراہیوں میں بھی مبتلا ہے۔ تقلید کی جکڑ بندیوں نے جہاں ایک طرف انھیں آیاتِ الٰہی میں تحریف اور احادیثِ نبوی میں تغیر و تبدل پر آمادہ کردیا اور اپنے ائمہ کو وہ مقام عصمت دے ڈالا جو انبیاء علیہم السلام کا خاصہ تھا، وہاں دوسری طرف یہ عیسائیوں کی طرح افراط و غلو میں بھی مبتلا ہیں۔ انھوں نے بھی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت نُوْرٌ مِّنْ نُوْرِ اللّٰہ کا عقیدہ گھڑ لیا اور انھیں الوہی صفات کا حامل قرار دے لیا۔ یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگئی جو آپ نے اپنی امت کے بارے میں فرمائی تھی جیسا کہ صحیح بخاری میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آپ نے فرمایا:

«لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوا جُحْرَ ضَبٍّ لَّسَلَكْتُمُوهُ، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! الْيَهُودَ وَ النَّصَارٰى؟ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: فَمَنْ؟»

''تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقے اختیار کرو گے، بالشت بہ بالشت اور

[1] جامع الترمذي، تفسير القرآن، باب و من سورة فاتحة الكتاب، حديث: 2954

دست بہ دست، یعنی ان کے قدم بہ قدم چلو گے حتی کہ اگر وہ سانڈھے کے بل میں بھی گھسے ہوں گے تو تم بھی یہ کام ضرور کرو گے۔

ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! پچھلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپ نے فرمایا:

اور کون ہیں؟''[1]

یعنی ان کے علاوہ اور کون ہے؟ یہی تو ہیں جن کی تم قدم بہ قدم پیروی کرو گے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمان پوری دنیا میں ذلیل ورسوا ہیں تو اس کی وجہ عقیدے اور عمل کی وہ خرابیاں اور گمراہیاں ہی ہیں جو پچھلی قوموں کی ذلت ورسوائی اور تباہی و بربادی کا سبب بنی تھیں اور آج وہ سب مسلمانوں نے اختیار کر رکھی ہیں۔ نہ ان کے عقیدے صحیح مسلمانوں والے ہیں اور نہ ان کے اعمال ہی صحیح مسلمانوں والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں گمراہی کے اس گڑھے سے نکالے تاکہ زوال اور بدبختی کے بڑھتے ہوئے سائے سے وہ محفوظ رہ سکیں۔

ضاد کے مخرج کی صحیح ادائیگی

﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کو اکثر لوگ ضاد کے بجائے دال کے ساتھ وَلَا الدَّالِّیْن پڑھتے ہیں کیونکہ ان کے لیے ضاد کا صحیح مخرج سے ادا کرنا مشکل ہوتا ہے تو وہ اسے دال کے مخرج سے ادا کرتے ہیں۔ ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ضاد کو ضاد ہی پڑھنا چاہیے، ضاد اور ظا دونوں قریب المخرج ہیں اور قریب المخرج حروف میں ایک دوسرے سے مشابہت ہو جائے تو کوئی شرعی قباحت نہیں لیکن اسے دال پڑھنا کسی طور پر بھی درست نہیں ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل، حديث:3456

[2] تفسير ابن كثير، الفاتحة 7:1

آمین کہنے کی فضیلت

سورۂ فاتحہ کے آخر میں آمین کہنے کی نبی ﷺ نے بڑی تاکید اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوا فَإِنَّهُ مَنْ وَّافَقَ تَأْمِينُهُ تَأْمِينَ الْمَلَائِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»

''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، یقیناً جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو گئی تو اس کے پچھلے تمام (صغیرہ) گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''[1]

آمین بالجہر کا مسئلہ

اس لیے جہری نمازوں میں، جن میں امام اونچی آواز سے قراءت کرتا ہے، امام اور مقتدی دونوں کو اونچی آواز سے آمین کہنی چاہیے۔ نبیٔ اکرم ﷺ جہری نمازوں میں اتنی اونچی آواز سے آمین کہتے کہ پہلی صف والے اسے سنتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی اونچی آواز سے آمین کہتے حتی کہ مسجد گونج اٹھتی۔[2]

بنابریں اونچی آواز سے آمین کہنا سنت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول ہے۔ تاہم اس میں غلو اور مبالغے کا اظہار نہیں ہونا چاہیے، یعنی گلا پھاڑ کر آمین نہ کہی جائے بلکہ اتنی آواز نکالی جائے جس میں عاجزی کی جھلک ہو کیونکہ یہ موقعہ عاجزی کے اظہار کا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، الأذان، باب جهر الإمام بالتأمين، حديث: 780

[2] صحيح البخاري، الأذان، باب جهر الإمام بالتأمين و سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب الجهر بآمين، حديث: 853 و سنن أبي داود، الصلاة، باب التأمين ورآء الإمام، حديث: 934 و سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 464

آمین کے معانی

آمین کے مختلف معنی بیان کیے گئے ہیں جو یہ ہیں:

- كَذَالِكَ فَلْيَكُنْ۔ اس کے معنی ہیں: ''اسی طرح ہو۔''
- لَا تُخَيِّبْ رَجَاءَ نَا۔ اس کے معنی ہیں: ''ہمیں نامراد نہ کرنا۔''
- اَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ لَنَا۔ اس کے معنی ہیں: ''اے اللہ ہماری دعا قبول فرما لے۔''

مفسر قرآن حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ کے علمی مقام میں کوئی کلام نہیں۔ ان کی مرقوم جامع اور مختصر تفسیر احسن البیان سے ایک دنیا استفادہ کر رہی ہے۔ حافظ صاحب اور ان کے مقربین نے محسوس کیا کہ تفسیر تفصیل کے ساتھ بھی شائع ہونی چاہیے۔ حافظ صاحب اس مقصد کے لیے میدان عمل میں اترے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ کی تفسیر شروع کی ہی تھی کہ یہ کام دیگر علمی مصروفیات کے باعث رُک گیا اور عرصے سے رُکا چلا آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ اہم کام دوبارہ شروع کرنے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی جلد نوبت آ جائے اور رب العالمین اس کے لیے مطلوبہ توفیق و اسباب عنایت کر دے۔

سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی پہلی اور مضامین کے اعتبار سے جامع ترین سورت ہے جو پورے قرآن مجید کا دیباچہ، مقدمہ، تمہید اور خلاصہ ہے۔ اس سورت کی عربی اور اُردو میں کئی ایک تفسیریں الگ سے شائع شدہ ہیں مگر محترم حافظ صاحب کا پُر زور استدلال اور صحیح احادیث کی روشنی میں تفسیری نکات مفہوم اور اسلوب کے اعتبار سے بڑے جامع ہیں۔ اس کی افادیت کے پیش نظر افادۂ عام کے لیے اسے شائع کیا جا رہا ہے جس کے پڑھنے اور پڑھانے سے فہم قرآن کے در کھلیں گے، باطل نظریات کا ابطال ہوگا اور خالص توحید اور تعلق باللہ کا حقیقی شعور فروغ پائے گا۔ خاص و عام بالخصوص طلبہ، علماء اور واعظین کے لیے یہ تفسیر بے حد مفید ہے۔ اس کا مطالعہ کیجیے اور دین و دنیا کی نعمتیں اپنے دامن میں سمیٹ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کا فہم اور اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یا رب العالمین!

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
DARUSSALAM
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک
ISBN 969-9134-56-9
9 789699 134562